سلسلہ مطبوعات مجلس
۸۵

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک

یعنی

مغربی ایشیا کے چھ مسلم اور عرب ممالک۔ افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور شرق اردن۔ کے ایک معلوماتی و دعوتی دورہ کی مفصل روداد و ڈائری جس میں ان ممالک کی دینی، فکری، سیاسی اور اقتصادی صورت حال کی سچی تصویر اور وہاں کی دینی و اصلاحی تحریکات، متضاد عوامل و اثرات اور ذہنی و روحانی کشمکش کا دیانت دارانہ جائزہ آگیا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

بار سوم

۱۳۹۸ھ-۱۹۷۸ء

کتابت ... ... ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ... ... لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ (آفسٹ)

صفحات ۳۰۴

قیمت ... ... چودہ روپے ۱۴

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(دارالعلوم ندوۃ العلماء)

دریائے کابل

سے

دریائے یرموک

تک

عربی پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۷۴ء ترکی

اردو دوسرا اور تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۷۸ء لکھنؤ

فہرست

حرف آغاز

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علیٰ

سید المرسلین

کچھ عرصہ ہوا کہ اس سفرنامے کے مصنف کو ایک وفد کی قیادت کی عزت حاصل ہوئی تھی، جسے مغربی ایشیا کے کچھ مسلم، اور عربی ممالک کا دورہ کرنا تھا، یعنی افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور اردن، یہ وفد ان وفود کے سلسلہ کی ایک کڑی تھا جنھیں مکہ مکرمہ سے رابطہ عالم اسلامی نے ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء میں دنیا کے مختلف اطراف میں بھیجا تھا اور جن کے پروگرام میں دنیا کے پانچوں براعظم شامل تھے، اور جن کا مقصد مسلمانوں کے حالات و کیفیات ان کے علمی و تہذیبی اداروں، اور ان کی ضرورتوں سے واقفیت بہم پہونچانا، اور وہاں کے باشندوں کو رابطہ کے مقصد و پیام سے آگاہ کرانا تھا۔

وہ سفر جس کا اس کتاب سے تعلق ہے، ۴ جون ۱۹۷۳ء سے ۲۰ اگست ۱۹۷۳ء کے درمیان ہوا تھا، مصنف نے اس سفر کی معلومات اور اپنے مشاہدات و تاثرات، ہونے والی

گفتگوؤں اور تقریروں، ملاقاتوں اور زیارتوں کا حال زیادہ تر اپنے حافظہ کی مدد سے لکھا ہے، اور کبھی کبھار اس کے لئے ٹیپ ریکارڈ سے بھی مدد لی گئی ہے، اس طرح یہ سفرنامہ ان ممالک کی زندگی کے مختلف گوشوں، ان کے مسائل و مشکلات، وہاں کی فکری، تہذیبی، اور نفسیاتی کشمکش اور ان کی رہنمائی کی ضرورتوں کی ایک بولتی ہوئی تصویر بن گیا ہے جس کی مدد سے ناظرین، اور ان ممالک کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو صحیح واقفیت، اور ان ممالک کے حالات و حوادث کا صحیح ادراک حاصل ہو سکتا ہے۔

یہاں خاص طور پر دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱۔ اس کتاب میں جو تاثرات و مشاہدات، تجویزیں اور تنقیدیں درج ہوئی ہیں، وہ اصلاً مصنف کتاب کے دل و دماغ پر اس سفر سے مرتب ہونے والے احساسات و تصورات کا عکس اور ان کا پرتو ہیں، اور ان کا تعلق مصنف کے مخصوص مطالعہ، اس کے تجربات، اور آراء و افکار سے ہے، اس لئے ان چیزوں کی ذمہ داری اور مسئولیت بھی اسی پر عائد ہوتی ہے، مصنف ان کے بارے میں ہمیشہ "رابطہ" ہی کا ترجمان نہیں رہا ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ "رابطہ" اس کتاب کے تمام مندرجات سے متفق ہو، اور نہ "رابطہ" پر مصنف کے ہر نقطۂ نظر، اور تمام افکار و خیالات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

۲۔ مصنف نے اپنے بیان میں تمام نزاکتوں اور باریکیوں، صداقت و انصاف، اور غیر جانبداری کا لحاظ رکھا ہے، اور حقیقت تک پہونچنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے، تاہم افراط و تفریط، غلطی، اور اشخاص، تحریکات اور اداروں کے بارے میں اظہار رائے میں نقص و کوتاہی سے خالی ہونے کا دعویٰ نہیں، اس کا امکان اور اندیشہ اس شخص کے لئے خاص طور پر ہے، جسے حالات نے ان ممالک میں طویل قیام، شخصی اور ذاتی واقفیت، اور تفصیلی جائزے کی اجازت نہیں دی،

اسی لئے بہت سے سیاح اور جہاں نورد اس قسم کی غلطیوں کے شکار ہوتے رہے ہیں، اس لئے ناظرین اگر اس قسم کی کوئی غلطی دیکھیں تو معذرت قبول کریں، غلطی اور سہو سے منزہ ذات تو صرف خدا کی ہے۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ اس سفر کا آغاز افغانستان کے دارالحکومت کابل سے اور اس کا اختتام اردن کے دارالحکومت عمان پر ہوا، اس مناسبت سے مصنف نے کتاب کا نام "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" رکھا ــــــ یہ دونوں تاریخی دریا ان دونوں ملکوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور ان سے ماضی و حال کے بہت سے تاریخی و اسلامی حوادث و حالات وابستہ ہیں، اور جن کے درمیان قرن اول کے اسلامی فتوحات کے دھارے نے ربط و اتصال پیدا کر دیا تھا۔

مصنف کو اس سے پہلے ایک اور سفرنامہ کی تالیف کا موقع ملا تھا، جو "مذکرات سائح فی الشرق العربی" (مشرق وسطیٰ کے سیاح کی ڈائری) کے نام سے ۱۹۵۴ء میں قاہرہ سے شائع ہوا تھا، اور ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ایک سفرنامہ اور روزنامچہ ہے۔[1]

اس طرح یہ سفرنامہ اسی سلسلہ کی گویا دوسری کڑی ہے، ناظرین ان دونوں سفرناموں سے نئے حوادث اور تبدیلیوں اور ۲۱ سال کی محدود عرصہ میں ہونے والے تغیرات کو جان پہچان سکتے ہیں! ان میں سن و سال، مطالعہ اور ذہنی ارتقاء کا فرق بھی محسوس ہوگا، جو لازمی اور قدرتی ہے، پھر وہ سفرنامہ ایک مفصل ڈائری اور سفر کا "کچا چٹھا" تھا، یہ سفرنامہ ان ملکوں کا اجمالی جائزہ پیش کرتا ہے، جو ان ملکوں کے دینی و تہذیبی مستقبل سے دلچسپی اور عالم اسلام کا درد رکھنے والوں کو غور و فکر کا سامان مہیا کرتا ہے اور کسی درجہ میں بے چین و مضطرب بھی بناتا ہے۔

---

[1] عزیزی مولوی شمس الحق ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اس سفرنامہ اور روزنامچہ کا ترجمہ اردو میں کیا اور "مکتبۂ فردوس، مکارم نگر لکھنؤ" نے "مشرق اوسط کی ڈائری" کے نام سے شائع کیا ہے۔

گرفتہ چینیاں احرام ومکی خفتہ در بطحا

یہ کتاب "من نہر کابل إلی نہر الیرموک" کے نام سے دار الہلال (انگورہ: ترکی) کی طرف سے جون ۱۹۷۲ء میں بیروت میں طبع ہوئی، کتاب کے پریس سے آنے سے پہلے ہی مصنف نے اس کے مختلف حصے اپنے مختلف عزیزوں اور رفیقوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے حوالہ کردیئے تھے، ان عزیزوں اور رفیقوں نے یہ خدمت خوش اسلوبی اور مستعدی سے انجام دی، اور عربی ایڈیشن کے نکلنے سے پہلے انھوں نے اس کے اردو ترجمے کا کام مکمل کرلیا، ان عزیزوں اور رفیقوں کے نام اپنی اپنی جگہ پر دیدیئے گئے ہیں، مصنف نے اس ترجمہ پر نظر ثانی کی، عربی ایڈیشن میں اکثر فارسی اشعار حذف کردیئے گئے تھے، اور عربوں کے ذوق کی رعایت میں عربی اشعار پر اکتفا کیا گیا تھا، بعض تفصیلات بھی جس کی عرب قارئین کو چنداں ضرورت نہ تھی، قلم انداز کردی گئی تھیں، اب نظر ثانی میں ان کو بھی شامل کرلیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب اپنی عربی اصل سے زیادہ مفید اور برصغیر کے اردو خواں طبقہ کے لئے زیادہ دلچسپ، اور ان کے ذوق کے زیادہ قریب ہوگئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے پورے الحاح واخلاص سے دعا ہے کہ کتاب کو نافع بنائے، اس کے ذریعہ تاریک راہوں کو روشن کرے، اور اس سے اسلامی پیغام، اور ان ممالک کی خدمت کرنے والوں، اور ان کو گھیرے ہوئے خطرات اور نئے چیلنج سے حفاظت کرنے والوں کے عزم وہمت کو طاقت پہونچائے۔ "وعلی اللہ قصد السبیل"۔

ابوالحسن علی ندوی

ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

۲۶ر۶ر۱۳۹۴ھ

۱۸ر۷ر۱۹۷۴ء

مجاہدین اور فاتحین کی سرزمین افغانستان میں

ترجمہ

نور عظیم ندوی

ہندوستان اور اسلام کی تاریخ میں افغانستان کا کردار

افغانستان اسلامی تاریخ کے ہر دور میں بہادروں اور شہسواروں کا مرکز، شیروں کا گڑھ، فاتحین اور سورماؤں ... کا مولد و منشا اور اسلام کا مضبوط قلعہ رہا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ امیر البیان امیر شکیب ارسلان اس ملک کا تذکرہ لکھنے بیٹھے تو اسلامی جوش سے مغلوب ہو گئے، اس مجاہد ملک کی تاریخ ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی وہ اشہب قلم کو قابو میں نہ رکھ سکے اور لکھ گئے :-

"میری جان کی قسم، اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے، کہیں بھی اس میں زندگی کی رمق باقی نہ رہے، پھر بھی کوہ ہمالیہ اور ہندوکش کے درمیان بسنے والوں میں اسلام زندہ رہے گا، اور اس کا عزم جوان رہے گا"[1]

افغانستان، ہندوستان کا پڑوسی ملک ہے، اور ایسا پڑوسی کہ پانچویں صدی[2] ہجری کی ابتدا سے

---

[1] حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۱۹۰

[2] پانچویں صدی ہجری کی ابتداء ہی میں سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی

دونوں کی تاریخ مشترک ہے، دونوں کی تہذیب وثقافت، زبان وادب، اور سیاست و حکومت ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتی رہی ہے اور انہی عوامل کی کارفرمائی اور باہم دگر اثر پذیری واثر انگیزی سے ایسی تہذیب اور ایسا نظام وجود میں آیا جسے پورے طور پر نہ افغانی کہا جا سکتا ہے، نہ ہندوستانی اور نہ خالص اسلامی آخری دور میں اسے "ہند افغانی اسلامی تہذیب" (INDO-AFGHAN MUSLIM CULTURE) کا نام دیا گیا۔

پانچویں صدی ہی سے ہندوستان پر یا تو ترک نسل سے تعلق رکھنے والے خاندانوں کی حکومت رہی جو افغانستان کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے، وہ جن ملکوں سے گذرتے، وہاں کے فوجی اور رضاکار بھی ان کے ساتھ ہو لیتے مثلاً غزنوی، خاندان غلامان کے سلاطین، خلجی، تغلق اور آخیر میں مغل یا وہ اپنی نسل، تہذیب اور روایات کے اعتبار سے افغانی ہی تھے، جیسے غوری، لودھی اور سوری خاندان، ہندوستان اسی زمانہ سے ان غیر معمولی جرأت و ہمت اور بے مثال شجاعت وشہامت والے اولوالعزموں اور شاہینوں اور عقابوں کی جولانگاہ رہا ہے، پہاڑوں سے گھرا ہوا ان کا اپنا ملک، ان کے بلند عزائم کے سامنے محدود اور تنگ نظر آتا اور فتح وظفر کے شوق کی تسکین اور شجاعت وشہامت کے جوہر دکھانے کے لئے انھیں مناسب میدان نہ ملتا تو ہندوستان کا رخ کرتے، ادھر ہندوستان مختلف اوقات میں ذہنی افسردگی، قوائے عمل کی سستی، بدنظمی اور سیاسی انتشار کا شکار ہوتا رہا ایسے اوقات میں حرکت وزندگی اور جوش وجذبہ سے بھرپور، جفاکش اور جنگجو افغانی ہندوستان کا رخ کرتے، قلیل تعداد کے باوجود بڑی بڑی فوجوں کو شکست دیتے، مضبوط و مستحکم حکومتیں قائم کرتے اور ہندوستانی معاشرہ کے تن ناتواں میں نیا خون دوڑا دیتے۔

اسی طرح افغانستان میں اندرون ملک یا سرحدوں پر بسنے والے بہت سے

خاندان ضروریات زندگی اور وسائل کی کمی کی وجہ سے تلاش معاش یا طالع آزمائی کے شوق میں ہندوستان آجاتے اس طرح کے قافلے عہد اسلامی کی ابتدا ہی سے ہندوستان آتے رہے وہ اپنے ساتھ اپنی بہترین خاندانی خصوصیات اور موروثی صلاحیتیں لاتے اور یہاں ہندستانی ماحول و معاشرہ سے یہاں کی خصوصیات، انداز و اطوار، اسلامی اقدار اور ہندوستانی اخلاق و آداب بھی حاصل کرتے ان کی بہادری، جرأت، غیرت اور ذہانت و فطانت میں مزید جلا پیدا ہو جاتی اور وہ اکثر شجاعت، غیرت، نخوت، ذوق کی لطافت اور احساس کی نزاکت میں اپنے قدیم ہم وطنوں سے بھی فائق ہو جاتے، اس طرح کے بہت سے قبائل ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے، اور انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں انھیں سے مختلف حکومتوں میں انتظامیہ کی مشینری فراہم ہوتی تھی، اور یہی ہر زمانہ میں فوج کی طاقت کا سرچشمہ اور اس کا بنیادی عنصر ہوتے۔

یہاں کے مسلمان طویل مدت تک افغانستان کو ایسا ملک سمجھتے رہے جو ہندوستان کے لئے فرمانروا، حکام، منتظمین اور فوجی برآمد کرتا تھا، وہ اس کو "ولایت" کہتے تھے جس طرح انگریزی دور حکومت میں انگلینڈ اور اس کے دار الحکومت لندن کو ولایت کہا جاتا تھا، افغانستان سے آنے والے "ولایتی" کہلاتے تھے، برآمد کا یہ سلسلہ، بہادر سپاہیوں، فاتحین فوجی سربراہوں تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ اس سے زیادہ وسیع اور عام ہو گیا، چنانچہ ہندوستان میں افغانستان سے ممتاز علماء اور اصحاب درس بھی تشریف لائے، اور بعض ایسی تصنیفات تحفہ میں دیں کہ علمائے ہند ایک مدت تک ان کے درس و تدریس اور شرح و تفصیل میں مشغول و منہمک رہے۔[1]

---

[1] جیسے علامہ محمد اسلم ہروی (م ۱۰۶۱ھ) اور ان کے ممتاز فرزند اور منطق کی مشہور کتاب (باقی صفحہ پر)

افغانستان ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں

ہندوستانی مسلمان جب سخت اور دشوار ترین مراحل سے گذرتے روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی ہر طرف یاس وناامیدی کے بادل امنڈتے دکھائی دیتے جبکہ عام طور سے انسان اتفاقات، حادثات اور خارجی امداد کا سہارا تلاش کرنے لگتا ہے تو وہ افغانستان کی طرف حسرت سے دیکھتے کہ شاید یہی ملک ان کو دشواریوں اور طوفانوں سے نجات دلائے گا، اکثر یہ حسن ظن اور خوش فہمی حدود سے بڑھ کر حسین خوابوں اور آرزوؤں تک پہنچ جاتی، اور وہ خطرناک حد تک خود اعتمادی کے فقدان کا شکار ہو جاتے، ہندوستانی مسلمانوں کی یہ توقع حیرت انگیز شکل میں اس وقت پوری ہوئی جب کہ دہلی میں مرہٹوں کی طاقت بہت بڑھ گئی اور اس کا خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے اور مسلمانوں کے رہے سہے اثر واقتدار اور سیاسی وزن ووقار کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے دہلی کی حکومت ان کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی اور مسلمان ان کے رحم وکرم پر تھے، مسلمانوں کی اضمحلال وانتشار کی شکار اور تھکی ہوئی فوجی طاقت اس ابھرتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھی، اس وقت مسلمانوں کی نگاہیں افغانستان کی طرف اٹھ گئیں کہ وہی ان کو اس جانکاہ مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے، اور بعض مسلمان رہنماؤں نے اپنے عہد میں مشرق کے سب سے بڑے فوجی رہنما احمد شاہ ابدالی کو ان حالات کی طرف توجہ

(باقی صفحہ ۱۷ کا) "رسالہ میر زاہد" کے مصنف، میر زاہد (م ۱۱۰۱ھ) ان کے اور ہندوستان کے دوسرے افغانی علماء کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی کتاب "نزہۃ الخواطر" خاص طور سے اس کی پانچویں اور چھٹی جلدیں۔

کرنے کی دعوت دی[1] جس کا ستارۂ اقبال نیا نیا طلوع ہوا تھا، اور متعدد معرکوں میں اس کی قیادت و شجاعت کے جوہر آشکارا ہو چکے تھے، یہ ۱۷۶۱ء کا واقعہ ہے کہ ہندوستان کی تمام مسلم طاقتیں مسلک و خیال کے اختلافات کے باوجود اس جھنڈے تلے جمع ہوگئیں اور (دہلی کے قریب پانی پت میں) مرہٹوں سے فیصلہ کن جنگ ہوئی، اس کے بعد مرہٹے سنبھالا نہیں لے سکے۔

انگریزی تسلط و اقتدار کے زمانہ میں افغانستان پر مسلمانوں کے مبالغہ آمیز اعتماد اور ان سے امداد کی توقع میں مزید اضافہ ہو گیا، ان کی نگاہیں مستقل شمال مغربی سرحدوں پر لگی رہتی تھیں کہ احمد شاہ ابدالی جیسا کوئی سالار لشکر اپنی "ٹڈی دل فوج" کے ساتھ "درۂ خیبر" پار کرے اور ان کو انگریز تسلط سے نجات دلائے، قدرتی بات تھی کہ ان کی توقع پوری نہیں ہوئی کیونکہ افغانستان خود اپنے اندرونی مسائل میں الجھا ہوا تھا، علاوہ ازیں وہ خود دوگونہ خطرات کی زد میں تھا، اس کی آزادی و استقلال کو ایک طرف برطانیہ سے خطرہ لاحق تھا، دوسری طرف روس سے، پھر ایک چھوٹا سا کمزور ملک ہندوستان پر حملہ کر کے طاقتور اور مستحکم انگریز حکومت کو کیسے شکست دے سکتا تھا، بہرحال ہندوستانی مسلمان اور آزادی کے متوالے برادران وطن ایک عرصہ تک انھیں خوابوں اور تمناؤں کی دنیا میں بستے رہے۔

امیر حبیب اللہ خاں فرزند امیر عبدالرحمن خاں ۱۹۱۹ء میں قتل کئے گئے اور ان کے بیٹے امیر امان اللہ خاں تخت نشین ہوئے تو انھوں نے انگریزوں کے مقابلہ میں مضبوط اور

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (م ۱۷۶۲ء) ان میں سب سے ممتاز ہیں، انھوں نے افغانی سردار احمد شاہ ابدالی کو کئی خطوط لکھے جس سے ان کی باخبری اور دوربینی کا اندازہ ہوتا ہے خطوط کے لئے ملاحظہ ہوں شاہ ولی اللہ کے سیاسی خطوط، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

جرأت مندانہ موقف اختیار کیا اور جنرل محمد نادر خاں کی قیادت میں افغانی فوج کو برطانوی فوجوں کے مقابلہ میں متعدد کامیابیاں حاصل ہوئیں تو امیر امان اللہ خاں مسلمانوں اور حریت پسندوں کی محبت و عقیدت کا مرکز اور ان کا محبوب و دل پسند موضوع گفتگو بن گئے ادھر مسلمان انگریز حکومت سے عاجز آ چکے تھے ملک کی سرزمین اپنی ساری وسعتوں اور پہنائیوں کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی، چنانچہ افغانستان کی طرف ہجرت کی لہر چل پڑی اور سیکڑوں ممتاز مسلمان اور تعلیم یافتہ انقلابی نوجوان ہجرت کر کے کابل پہنچ گئے، لیکن چونکہ یہ اقدام کسی سوچے سمجھے پروگرام کے تحت نہیں ہوا تھا، اور کسی بھی راہنما نے نہ تو اس سے پیدا ہونے والے مسائل اور متوقع نتائج پر غور کیا تھا، نہ اس سلسلہ میں افغانی حکومت سے کوئی مفاہمت ہوئی تھی، بالآخر تحریک ناکام ہو گئی اور ہجرت کرنے والوں کو بعض دشواریاں بھی پیش آئیں۔

پھر بعض معاملات میں امیر امان اللہ خاں کی بعض جدتیں اسلامی روایات کی مخالفت، مصطفےٰ کمال پاشا کی تقلید میں اہل مغرب کی نقالی اور اپنی ملکہ کو بے پردہ نکالنے کی وجہ سے افغانی قوم میں ان کے خلاف سخت ناراضگی پھیل گئی، اور وہاں انتشار برپا ہو گیا انگریز بہت دنوں سے اس کی تاک میں تھے، انھوں نے اس شورش کو امیر امان اللہ خاں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے استعمال کیا، اور اس سے پورا فائدہ اٹھایا، ۱۹۲۹ء میں امیر امان اللہ خاں تخت سے ہٹائے گئے اور وہاں حبیب اللہ عرف "بچہ سقہ" برسر اقتدار آ گیا، ان حالات سے اہل ہند بہت متاثر اور فکرمند ہوئے، جیسے یہ ان کے اپنے ہی ملک کے مسائل ہوں، یہاں تک کہ جنرل نادر خاں سامنے آئے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور حالات درست کئے تو افغانستان سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی سکون قلب میسر آیا۔

اور یہ تو ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ جنرل محمد نادر خاں نے علامہ اقبال سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کو ۱۹۳۳ء میں اپنے ملک کے بعض اسلامی و تعلیمی مسائل میں مشورہ کے لئے دورۂ کابل کی دعوت دی، ان حضرات نے بخوشی دعوت قبول کی اور اسے ایک قدیم اسلامی مملکت کی زیارت اور ایک مسلمان مجاہد سربراہ سلطنت سے ملاقات کے لئے قیمتی موقعہ شمار کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم وہاں سے واپس تشریف لائے تو بہت ذوق و شوق سے وہاں کے حالات و تاثرات بیان کرتے تھے، وہ شاہ کی ملاقات سے بہت گہرا اثر لے کر لوٹے تھے، اور لکھنؤ ہی میں مقیم تھے کہ اچانک شاہ کی شہادت کی خبر ملی جس سے وہ بہت مغموم و متاثر ہوئے۔

انگریزی دور حکومت میں ہندستان اور افغانستان کی سرحدیں کھلی ہوئی تھیں، وہاں سے تاجر، علماء اور طلبہ آتے تھے، اہل ہندان کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اور ان کو اپنے سے زیادہ طاقتور اور غیور سمجھتے تھے، ہمارے بچپن میں کابل کے تاجر اپنے علاقہ کی مختلف اشیاء لئے اکثر دیہاتوں اور شہروں میں گھومتے پھرتے نظر آتے وہ نمازوں کے بڑے پابند ہوتے تھے، ان کی جسمانی قوت، ان کی ہیئت کذائی اور ان کا ڈھیلا ڈھالا لباس لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا، بچے ان سے بہت ڈرتے تھے، انھیں "آغا" کہتے تھے، بچپن میں ہم نے صرف اسی طرح کے ملک میں گھومنے پھرنے والے تاجر قسم کے افغانی دیکھے تھے لیکن جوں جوں عمر اور اس کے ساتھ معلومات میں اضافہ ہوا تو اپنے پڑوسیوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا، خاصی معلومات حاصل کیں اور اس ملک کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

سفر افغانستان میں تاخیر

میری زندگی میں بیرونی سفر اور غیر ممالک کے دورے کوئی نئی بات نہیں، میں نے کئی مرتبہ مختلف عرب ممالک کا دورہ کیا ہے، متعدد بار یورپ بھی گیا ہوں، عالم اسلام کے فردوس گم گشتہ، اندلس (اسپین) کی بھی زیارت کی ہے، مغربی ایشیا کے اکثر، اور بحر ہند کے بعض ممالک میں بھی جانا ہوا ہے، قرائن اس کے موجود تھے کہ اس پڑوسی ملک کے دورہ کا بھی موقع ملتا، ہندوستان کی آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے، کابل اور غزنین میں ہمارے بعض احباب بھی تھے، جن سے قدیم دینی و علمی روابط تھے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ) کی دعوت اصلاح و تجدید اور تحریک جہاد میں بھی افغانستان کا بڑا اہم کردار رہا ہے، وہ اپنی سرگرمیوں اور جد و جہد کے مرکز تک افغانستان ہی کی راہ سے پہنچے تھے، اہل افغانستان نے بے نظیر جوش و خروش کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا، پوری قوم اور حکومت ان کی طرف جھک پڑی تھی، اور حکمراں خاندان سے بھی ان کے تعلقات رہے تھے، کبھی مستحکم اور کبھی کمزور، جس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے[1]۔ اگر اس فیصلہ کن اور تاریخی موقع پر افغانستان کے امراء نے وقت کی اہمیت کا اندازہ لگایا ہوتا، اس تحریک کی قدر کی ہوتی اور اس کے قائد کے اخلاص، اس کی دردمندی اور اثر انگیزی کو صحیح طور پر محسوس کیا ہوتا، تو اس علاقہ میں مسلمانوں کی تاریخ آج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تابناک اور باعظمت ہوتی۔

---

[1] افغانستان میں وہی خاندان اب تک برسر اقتدار رہے، سید احمد شہیدؒ کی دعوت و تحریک کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ"۔

میں نے نوجوانی ہی کے دور میں سید احمد شہیدؒ اور ان کی دعوت پر ایک کتاب لکھی تھی[۱] اور شمالی سرحد کے ان علاقوں کو بار بار دیکھ چکا تھا جہاں جہاد کے معرکے گرم ہوئے تھے اور ان کا اسلامی نظام قائم ہوا تھا، مگر اس دعوت کی تاریخ سے گہری دل چسپی، اس موضوع پر مطالعہ وتحقیق، بہادر اور غیور افغانی قوم اور اس کی اپنے ملک سے محبت وتعلق کی قدر کے باوجود مجھے اس ملک کی زیارت کا موقعہ نصیب نہیں ہوا۔

رابطۂ عالم اسلامی کا وفد

اللہ تعالیٰ رابطۂ عالم اسلامی کا بھلا کرے کہ اس نے شجاعت وسرفروشی کی اس سرزمین کی زیارت کا موقع فراہم کر دیا، ساری سہولتیں مہیا کیں اور اس کے ذمہ داروں نے اتنا اصرار کیا کہ میری معذوریاں، مشاغل کی کثرت اور دوسری رکاوٹیں سد راہ نہ بن سکیں اور میری ایک دیرینہ تمنا کے برآنے کی صورت پیدا ہو گئی، رابطہ نے ـــــــ افغانستان ایران اور مغربی ایشیا کے بعض عرب ممالک کے دورہ کے لئے ایک وفد کی تشکیل کی، مجلس تاسیسی (FOUNDATION BODY) کے دو ممبران اس کے رکن منتخب ہوئے اور رابطہ کی سکریٹریٹ میں اسلامی تنظیموں کے شعبہ کے ذمہ دار ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو وفد کے سکریٹری اور میرے خاص رفیق ومعاون کی حیثیت سے وفد میں شامل کیا گیا اور اس وفد کی قیادت وسربراہی کی ذمہ داری مرے ناتوان کاندھوں پر ڈالی گئی لیکن دونوں

---

[۱] سیرت سید احمد شہیدؒ جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا، مصنف نے اس میں اضافہ کا سلسلہ جاری رکھا، حال میں اس کا اضافہ شدہ ایڈیشن پانچ پانچ سو صفحات کی دو ضخیم جلدوں میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔

معزز ممبران ـــ بیروت کے شیخ سعدی یاسین اور سری لنکا کے مسٹر حنیفہ محمد حنیفہ سابق وزیر لنکا بعض اسباب وعوائق کی بنا پر ہندوستان نہیں آسکے، تو رابطہ کے سکریٹریٹ کی نظر انتخاب سعودی عرب کے مشہور و ممتاز صاحب قلم، مجلس شوریٰ کے رکن، جامعہ ملک عبدالعزیز جدہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے پروفیسر شیخ احمد محمد جمال پر پڑی یہ انتخاب بڑا موزوں و مناسب تھا، اتوار ۳ر جون ۱۹۷۳ء کی صبح کو وہ مکہ سے براہ راست کابل پہنچ گئے اور میں بعض اسباب کی بنا پر ایک دن کی تاخیر سے ۴ر جون ۷۳ء کی شام کو کابل پہنچا۔

محترم شیخ صالح قزاز سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی کی سربراہی میں امانت عامہ (جنرل سکریٹریٹ) پہلے ہی سے وفد کے پروگرام اور دیگر سہولیات کے سلسلہ میں افغانستان کے ذمہ داروں اور کابل میں سعودی سفارت خانہ سے رابطہ قائم کر چکی تھی تاکہ وفد بہتر طریقے سے اپنے فرائض انجام دے سکے اور اپنا پیغام پہنچا سکے۔

حکومت افغانستان نے دنیا کے عظیم ترین اور اہم ترین اسلامی ادارہ کی نمائندگی کرنے والے اس وفد کو خوش آمدید کہا جس میں سارے عالم اسلام کے علماء، فضلا، مفکرین، اور اصحاب رائے کی بڑی تعداد کی نمائندگی ہے، اور جو ایسے شہر میں قائم ہے جس کی مسلمانوں کے دلوں میں بڑی عزت و عظمت ہے اور خادم الحرمین الشریفین اور اتحاد اسلامی کے سب سے بڑے داعی شاہ فیصل جس کی سرپرستی فرماتے ہیں۔

افغانوں کی مہمان نوازی اور اکرام ضیف مشہور ہے، چنانچہ قدیم روایات کے مطابق افغانی حکومت نے اصرار کیا کہ وفد سرکاری مہمان رہے، اور وزارت تعلیم کے سپرد کیا کہ وفد کے لئے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرے، سفروں اور ملاقاتوں کا پروگرام مرتب کرے، اور سعودی سفارت خانہ نے شکریہ کے ساتھ یہ کریمانہ پیشکش قبول کرلی۔

سرزمین کابل میں

ہم دوشنبہ ۴؍جون ۱۹۷۳ء کو دہلی سے ایک افغانی طیارہ کے ذریعہ روانہ ہوئے، اناؤنسر نے اعلان کیا "کابل قریب آگیا ہے" تو کانوں میں نغمگی اور دل میں شگفتگی محسوس ہوئی کہ آج ایک دیرینہ تمنا پوری ہو رہی تھی، مقامی وقت کے مطابق ۵ بجے شام ہمارا طیارہ کابل ہوائی اڈے پر اترا، موسم مناسب تھا۔

دہلی کے سخت موسم کے مقابلہ میں اعتدال سے زیادہ قریب، ہمارے استقبال کے لئے افغانستان میں سعودی سفیر، ہمارے پرانے کرم فرما، ہندوستان میں سابق سعودی سفیر اور ہندوستانی مسلمانوں کی محبوب شخصیت شیخ محمد الحمد الشبیلی ہوائی اڈہ پر موجود تھے، ان کے ساتھ سعودی سفارت خانہ کے نائب سفیر علی الفوزان، ہمارے وفد کے ممبر شیخ احمد محمد جمال، کابل یونیورسٹی میں "کلیۃ الشریعۃ" کے پرنسپل غلام محمد نیازی، افغانی وزارت تعلیم میں دینی تعلیم کے ڈائرکٹر شیخ محمد اسلام تسلیم، دارالحفاظ کابل کے مدیر سید محمد یعقوب ہاشمی، کلیۃ الشریعۃ کے استاذ پروفیسر عبدالرسول سیاف اور دوسرے ممتاز علماء و اعیان بھی موجود تھے، پروفیسر سیاف ہی کو وزارت تعلیم نے ہمارے وفد کا رفیق اور مترجم منتخب کیا تھا۔

ہوٹل کابل میں ہمارے قیام کا انتظام تھا، اور حسن اتفاق کہ چالیس سال پہلے علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال اور سر راس مسعود پر مشتمل وفد کابل کے دورہ پر آیا تھا تو اسی ہوٹل میں قیام پذیر ہوا تھا، اس عرصہ میں اس کی عمارت نئی تعمیر کی گئی، اور بعض اصلاحات بھی کر دی گئی ہیں، میں جس کمرہ میں مقیم تھا، اس کی کھڑکی امیر عبدالرحمٰن خاں غازی کے مقبرہ کی طرف کھلتی تھی، انگریزوں سے جنگ اور اسلام سے بیگانہ دور دراز علاقوں میں اشاعت اسلام کے

سلسلے میں ان کے عظیم الشان کارنامے مشہور ہیں[1] اس سے عظمت رفتہ اور اچھے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

وزارتِ تعلیم کی ضیافت اور رہنمائی میں

ہم کو کابل میں کل چھ دن گذارنے تھے، اور مقامی وزارت تعلیم نے سعودی سفارتخانے کے تعاون سے مختلف مقامات کے دوروں، ملاقاتوں، جلسوں اور تقریروں کا تفصیلی پروگرام مرتب کرلیا تھا، اور اس پروگرام کی ترتیب وتشکیل بلکہ وفد سے غیر معمولی دلچسپی اور اس کے اعزاز واکرام زیادہ تر کلیۃ الشریعہ (کلیہ فاکولتہ شرعیات۔ پوہنتون کابل) کے پرنسپل ڈاکٹر غلام محمد نیازی کا رہین منت ہے، انھوں نے پہلا مناسب کام تو یہ کیا کہ کلیۃ الشریعۃ کے استاذ پروفیسر عبدالرسول سیاف کو وفد کا رفیق اور مترجم مقرر کیا، وہ افکار وخیالات ترجمہ پر قدرت اور جوش وجذبہ، ہر اعتبار سے اس نازک اور دشوار کام کے لئے موزوں ترین شخص تھے، میں نے ان کے جیسا ترجمہ پر قادر، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے والا اور متکلم کی صحیح ترجمانی کرنے والا کم دیکھا ہے، وہاں کے نوجوانوں سے ان کے تعلقات بھی وسیع اور گہرے ہیں،

---

[1] امیر شکیب ارسلان "حاضر العالم الاسلامی" پر اپنے مشہور اور بیش قیمت حواشی میں امیر عبدالرحمٰن کی سیاسی وانتظامی خصوصیات وامتیازات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "مشرقی جانب حدود سلطنت کو وسیع کیا، وادی کفرستان کو اپنے زیر نگیں کرلیا، وہاں کے باشندوں کو انھیں کے ذریعہ اللہ نے اسلام کی ہدایت دی اور اس کا نام "نورستان" رکھا، مختصر یہ کہ انھی کے زمانہ میں افغانی قوم سکون وآرام سے لذت آشنا ہوئی اور اتحاد کا مفہوم سمجھا، وہ ملک کی اصلاح میں منہمک رہے، یہاں تک کہ اللہ نے ان کو ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں جوار رحمت میں جگہ دی وہ حکومت حسن انتظام اور عزائم کی پختگی میں اپنے زمانہ کے بہترین بادشاہوں میں شمار کئے جاتے تھے" (حاضر العالم الاسلامی ج ۲ صفحہ ۲۷۵)

اور صحیح اور صالح بنیادوں پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی عقلی و فکری تربیت اور ذہنی رہنمائی کی بڑی فکر رکھتے ہیں، جامع ازہر کے "کلیہ اصول الدین" کے فارغ التحصیل ہیں، ملاقات سے پہلے میری بعض کتابیں پڑھ چکے تھے، موصوف اور ان کے رفقاء سید قطب شہید، مولانا مودودی اور راقم الحروف کی کتابوں سے بہت متأثر ہیں، اور مقامی دونوں زبانوں ـــ فارسی اور پشتو ـــ میں ان کے تراجم کے خواہش مند بھی، اس رجحان میں دو اور معزز علماء ـــ ڈاکٹر محمد موسیٰ توانا اور برہان الدین ربانی ـــ ان کے شریک و ہمہم ہیں، مؤخر الذکر کی متعدد تصنیفات اور تراجم زیور طبع سے آراستہ بھی ہو چکی ہیں۔

ہم نے کابل میں جو چھ دن گذارے وہ تعداد میں اور ملک کی وسعت و اہمیت کے اعتبار سے تو بہت کم تھے، لیکن پروگراموں اور مشاغل کی کثرت کے اعتبار سے بہت مشغول بہت مفید اور قیمتی تھے، اور قیام کے اس اختصار ـــ جس پر ہم بعض اسباب کی وجہ سے مجبور تھے، ـــ کی ہمیں قیمت بھی چکانی پڑی، متواتر کام، گتھے ہوئے پروگرام اور تھکا دینے والی مسلسل مشغولیت برداشت کرنی پڑی، اکثر ایک ہی دن میں چار، چار، پانچ، پانچ پروگرام اکٹھا ہو جاتے جن میں بعض بڑے اداروں کو دیکھنا، طلبہ و اساتذہ سے خطاب، اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں اور دعوتوں میں شرکت وغیرہ شامل ہوتے، ادھر ادھر آنے جانے، لوگوں سے ملاقاتوں اور بات چیت میں پورا دن گذر جاتا اور تھکے ہارے رات گئے واپس آتے لیکن افغانی علماء و عمائدین کے خیر مقدم، نوجوانوں کے جوش اور ان کی توجہ و دلچسپی کی شکل میں ہماری محنت و مشقت اور چین و سکون سے محرومی کا بہترین صلہ مل جاتا۔

تعلیمی و ثقافتی اداروں کا معائنہ

تعلیمی اداروں میں ہم سب سے پہلے کابل کے ایک نواحی محلہ بگرامی میں واقع

"مدرسہ ابی حنیفہ" دیکھنے گئے اور وہاں کے اساتذہ وطلبہ سے گفتگو ہوئی، مدرسہ ابتدائی وسطانی اور ثانوی تین مراحل پر مشتمل ہے، مدرسہ کے ناظم استاذ محمد سیلانی ہیں اس کے درجوں، ہوسٹلوں اور مطبخ دکھلانے لے گئے، ہم نے متعدد طلبہ اور اساتذہ سے گفتگو بھی کی اور مسجد میں عمومی خطاب کیا، طلبہ کے عربی سے واقف ہونے کی وجہ سے فارسی میں ترجمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اس کے بعد ہم مدرسہ "دارالحفاظ" میں گئے اس کے ناظم سید محمد یعقوب ہاشمی نے ہمارا استقبال کیا، ہمارے اعزاز میں ایک جلسہ بھی منعقد کیا جس میں مدرسہ کے اساتذہ اور کابل کے علماء و شیوخ کی اہم تعداد نے شرکت کی، اس کے بعد "دارالعلوم" دیکھنے گئے، یہ دارالسلطنت میں سب سے بڑا دینی ادارہ ہے، میں نے سنا کہ موجودہ وزیر اعظم ڈاکٹر محمد موسیٰ شفیق بھی اس ادارہ کے تعلیم یافتہ ہیں، اس کا اسٹاف فاضل علماء اور بڑے بڑے شیوخ پر مشتمل ہے، اس کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مولوی محمد گل ہیں، اس کی صحن میں ایک بڑا جلسہ ہوا، شہر کے علماء، معززین اور اعیان شہر بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور وفد کا پرجوش استقبال کیا گیا، میں نے اور استاذ احمد محمد جمال نے تقریریں کیں، میری تقریر خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے کارناموں، ان کی غیرت ایمانی، مرتدین اور مجرمین سے دین کی حفاظت وحمایت اور ان کے یادگار مقولہ "أینقص الدین وأنا حيّ" (دین میں ترمیم وتنسیخ ہو اور میں زندہ رہ کر اس کو دیکھتا رہوں؟) کی تشریح وتفصیل، اور اپنے اپنے ممالک اور علاقوں میں علماء کی ذمہ داریوں سے متعلق تھی، اس سلسلہ میں میں نے حضرت مجدد الف ثانی کے کارنامہ کو جو ہندوستان کو اسلامی حصار میں رکھنے کے لئے انجام دیا گیا، تفصیل سے بیان کیا، اس لئے کہ افغانستان کے موجودہ حالات و دور کو مجدد صاحب کے دور سے خاص مناسبت ہے، اور ان کی شخصیت یہاں ہر حلقہ میں معروف ومحترم ہے، چونکہ

فضا علمی و دینی تھی، اکثر حاضرین عربی زبان سمجھتے تھے، اور ترجمہ کی رکاوٹیں اور الجھنیں نہیں تھیں، اس لئے بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ اپنی بات پیش کی۔

ہمیں جن عربی اداروں میں جانے اور وہاں کے علماء اور نوجوانوں سے گفتگو کا موقع ملا، اس میں سب سے اہم اور ممتاز "کلیۃ الشریعۃ" تھا، ارکان وفد کے لئے یہ فطرۃً دلچسپی کی جگہ تھی، اس لئے کہ یہاں وہ نوجوان زیر تعلیم ہیں جن سے اس ملک میں دینی قیادت کی زیادہ سے زیادہ امید کی جا سکتی ہے۔ یہاں کے اساتذہ بھی اپنی ذہنی، علمی صلاحیتوں اور علم و مطالعہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، یہی کالج وفد کا اصل میزبان تھا، اس کے پرنسپل ڈاکٹر غلام محمد نیازی کا شمار تحقیقی ذوق رکھنے والے علماء میں ہوتا ہے، اسلامیات پر ان کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے، کالج نے احباب و رفقاء کے تعارف کے لئے ایک عشائیہ کا بھی اہتمام کیا، یونیورسٹی ہال میں منعقد ہونے والے عظیم الشان جلسہ کا انتظام و اہتمام بھی اسی کالج کی طرف سے ہوا تھا جس میں بعض ممالک کے سفراء، ممتاز علماء، اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات، سرکاری ملازمین، تعلیم یافتہ نوجوان اور کالج کے طلبہ کی بڑی تعداد موجود تھی ــــ اس جلسہ کی تقریر عنقریب نظر سے گذرے گی۔

ہم نے "ملالی گرلس کالج" بھی دیکھا جو تحریک آزادی کی قائد ایک افغانی خاتون ــ ملالی ــــ کی طرف منسوب ہے، استاذ احمد محمد جمال نے یہاں ایک موزوں اور مناسب تقریر کی جس میں انھوں نے شریعت اسلامیہ میں مسلمان عورت کی حیثیت اور مسلم معاشرہ میں اس کے حقوق، اس کی اہمیت اور قدر و منزلت پر روشنی ڈالی، اس کالج میں ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے ہم یورپ کے کسی گرلس کالج یا مغربی ممالک کے کسی زنانہ ثقافتی مرکز میں پہنچ گئے ہیں، بے پردگی عام تھی، لیکن ساتھ ہی شرم و حیا اور حجاب نظر کے آثار بھی نظر آتے تھے جس میں

افغانی خواتین کسی زمانہ میں ضرب المثل تھیں، اس جلسہ میں احتیاط اور ذہانت کے ساتھ مقرر سے متعدد سوالات بھی کیے گئے، استاذ احمد محمد جمال نے قابلیت اور سلیقہ کے ساتھ ان کے جوابات دیئے، وہ مسلمان عورت کے حقوق اور اس مسئلہ میں اسلامی قانون اور دوسرے قوانین کے تقابل کے خصوصی ماہرین میں سے ہیں، کالج کی خاتون پرنسپل نے مطالبہ کیا کہ تعدد ازدواج کی حرمت کا متفقہ فتویٰ صادر کر دیا جائے، کیونکہ اس میں عورت کی سخت توہین ہوتی ہے، مقرر موصوف نے اس کے جواب میں وہ اسباب و مصالح بتلائے جن کی وجہ سے اسلام نے یہ حق باقی رکھا ہے۔

ہم لڑکوں کا جدید طرز کا ایک کالج "مدرسہ استقلال" بھی دیکھنے گئے، اس پر فرانسیسی رنگ غالب ہے، اس کے پرنسپل استاذ عبدالهادی فرانس کے تعلیم یافتہ ہیں، یہاں مجھ کو نوجوانوں سے کچھ کہنے کا موقع ملا، میری باتیں کسی کامل کو قابلِ تقلید نمونہ، یا اسوہ (IDEAL) بنانے اور نوجوانوں کی تربیت اور ان کی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر میں اس کے اثرات کے موضوع پر تھیں۔

تجدد پسند افغانی خواتین سے گفتگو

سعودی سفارت خانہ کی شدید خواہش تھی کہ کابل میں ہمارے مختصر ترین قیام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے، وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر علمی و دینی مجلسوں اور ہر طبقہ کے تعلیم یافتہ اور ممتاز افراد سے تعارف اور ملاقاتوں کا انتظام کر رہا تھا، چنانچہ سفیر کی وسیع اور شاندار قیام گاہ پر دو مخصوص نشستیں ہوئیں، ایک نشست ممتاز، معزز اور دیندار گھرانوں سے تعلق رکھنے والی مسلم خواتین کی تھی، مجلس میں شریک ہونے والی خواتین الحمد للہ کا شکر ہے

اسلامی عقائد سے باغی یا جدید تہذیب و تمدن کے زعم میں دین سے یکسر بیگانہ و بیزار نہیں تھیں۔

افغانی خواتین میں جدید تہذیب اور مستشرقین کے افکار کے اثرات

پھر بھی ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ ملک میں مغربی تہذیب بہت آگے جا چکی ہے اور اس کے ثمرات بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۷۳ء کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔

امیر امان اللہ خان کے دور تک افغانی قوم اسلامی افغانی روایات پر بڑی مضبوطی سے قائم تھی اسے دانتوں سے پکڑے ہوئے تھی، اس کا تصلب غلو اور مبالغہ کی حد تک پہنچا ہوا تھا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ امیر امان اللہ خان کی بعض قدیم اسلامی روایات کی خلاف ورزی کی بنا پر ان کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا، اور ان کو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا، لیکن اس وقت صورت حال بالکل مختلف ہے، افغانی قوم اپنے ماضی سے بہت دور جا پڑی ہے، اور یہ دوری ماہ و سال کی تعداد کے اعتبار سے تو بہت کم ہے یعنی صرف پینتالیس[۴۵] سال لیکن فکری اور تمدنی اعتبار سے یہ مسافت بہت طویل ہے، اکثر قومیں کہیں صدیوں میں اتنی مسافت طے کرتی ہیں، پردہ اب پس ماندگی، جہالت اور غربت کی علامت بن گیا ہے، اسی وجہ سے دیہاتوں، گاؤں میں بعض دیندار علماء اور دارالسلطنت سے دور کسانوں کے گھروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، فرنگی لباس عام ہے، پھر بھی قدیم ماحول اور طبیعتوں میں رچی ہوئی اسلامی خصوصیات کے اثرات اب تک ان تعلیم یافتہ مسلم خواتین میں کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہیں، اس لئے ان کے سوالات اور گفتگو میں توہین و استہزا کا انداز نہیں تھا، بلکہ ہم لوگوں سے دوران گفتگو

وہ خاصی محتاط رہیں، ان کی باتوں سے دین اور اہل دین کا احترام جھلکتا تھا، وہ اسلام میں عورت کی حیثیت اور اس کے عطا کردہ مراتب و حقوق معلوم کرنے کا شوق ظاہر کرتی رہیں لیکن ان کے سوالات سے صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ غیروں کی تہذیب و تمدن کے اثرات کہاں تک پہنچ چکے ہیں، اور مستشرقین کی تحریریں اور اسلام، اس کے اصول و مبادی اور اسلامی نظام حیات کے خلاف ان کا منظم اور منصوبہ بند پروپیگنڈا اور یورپ کے پھیلائے ہوئے کامل مساوات مرد و زن کے نظریہ کے اثرات کتنی گہرائی تک اتر چکے ہیں، اس کے مقابلہ میں اسلام اور اسلامی شریعت کو جدید اور مؤثر انداز میں پیش کرنے اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن کو مطمئن کرنے کے سلسلہ میں مسلمان اصحاب دعوت و ارشاد، اہل قلم اور علمائے کرام کی کوتاہیوں کا بھی ہم کو احساس ہو رہا تھا، بہر حال دونوں طبقوں ——— دین کے نمائندہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ ——— کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج بہت وسیع ہو گئی ہے جس کو پر کرنا آسان نہیں ہے۔

اس مجلس میں ہمارے فاضل رفیق استاذ احمد محمد جمال نے گفتگو کی اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، وہ اس موضوع کے ممتاز ماہرین میں سے ہیں، اور اس سلسلہ میں خاصا کام بھی کر چکے ہیں، ان کی کتاب "مکانک تحمدی" اس موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے، میں نے بھی مناسب سمجھا کہ ذہن کو تیار و ہموار کرنے کے لئے عمومی انداز کی ایک بات سامنے رکھ دوں، چنانچہ میں نے کہا۔

بے پردگی اور معاشرتی قدروں سے بغاوت قومی زوال کا پیش خیمہ

"میں نے قوموں اور تہذیب و تمدن کی تاریخ ——— (اور خاص طور سے قوموں اور تہذیبوں کے ارتقاء و انحطاط کی تاریخ) کا مطالعہ بڑی توجہ اور انہماک سے کیا ہے، اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قوموں اور ملتوں کے زوال، ان کی تباہی و بربادی

اور انتہائی ترقی یافتہ اور مسحور کن تمدنوں اور تہذیبوں کے زوال اور فنا کا سب سے
اہم اور بنیادی سبب ہے ان کے عائلی نظام کا انتشار، گھریلو زندگی میں اعتدال و
توازن کا فقدان، مرد و زن کے ارتباط باہمی میں فساد و اختلال، گھریلو زندگی سے
عورتوں کی بے توجہی اور اس کی ذمہ داریوں سے فرار ـــــ تاریخ میں جہاں بھی
زوال پذیر تہذیبیں اور پستی و انحطاط اور تباہی و بربادی کی طرف تیز قدموں سے
بھاگتی ہوئی قومیں نظر آتی ہیں، وہاں یہ بیماری ضرور پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ
عورتوں نے گھریلو زندگی سے فرار اور اس کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی شروع
کردی، وہ مامتا کے جذبہ سے محروم ہوگئیں، اولاد کی پرورش و پرداخت اور
نئی نسل کی تربیت اور اس کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں اور اپنے گھر کو سکون و
اطمینان کا گھر بنانے سے غافل ہوگئیں جہاں مرد کو امن و عافیت اور سکون و
راحت کی دولت میسر آسکے وہ گھر میں داخل ہو تو محسوس کرے جیسے جنت میں
آگیا ہو، بلکہ اس کے بجائے وہ مردوں کی ذمہ داریوں اور ان کی کارگزاری کے
میدانوں میں برابر کی شرکت، ان کی ہم سفری اور ہم صفیری، ہر میدان میں ان کے
دوش بدوش کھڑے ہونے، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا مقابلہ کرنے کے
شوق میں پاگل ہوگئیں، اور اس کے نتیجہ میں ان معاشروں میں، ذہنی و فکری انتشار،
عام لاقانونیت، انارکی اور اخلاقی بحران پیدا ہوگیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکت کے
غار کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے قدم اور تیز ہوگئے، یہی قدیم یونانیوں کی کہانی
ہے اور یہی قدیم رومیوں اور ایرانیوں کے زوال کی داستان ہے، اور مجھے
خطرہ ہے کہ کہیں مشرقی قومیں بھی اسی دردناک انجام سے دوچار نہ ہوں اور

رنج وفکر کی بات ہے کہ ہمارے مشرقی اسلامی معاشرہ میں اس کے آثار
ظاہر بھی ہو چکے ہیں:

جزوی ترمیم واصلاح کے ساتھ یہ میری وہاں کی تقریر کا خلاصہ ہے (اور تحریر و تقریر میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہی ہے) امید ہے کہ ہماری یہ سطریں معزز افغانی بہنوں تک پہنچیں گی کاش کہ یہ ان پیش آنے والے خطرات کا احساس دلانے میں کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔

اس کے بعد استاذ احمد محمد جمال نے ایک عالمانہ تقریر کی اور عورت کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر، معاشرہ میں اس کے حدود، اور زندگی میں اس کے فرائض اور اچھے خاندان اور صالح معاشرہ کی تشکیل میں عورت کے اہم کردار کی تشریح کی، پھر سوالات کا ایک سیلاب امنڈ پڑا، اکثر سوالات تعدد ازدواج، حق طلاق کے لئے مردوں کی خصوصیت اور شرعی پردہ سے متعلق تھے، مجلس سکون و وقار کی فضا میں ختم ہوئی اور تمام خواتین و حضرات شام کے کھانے اور عشاء کی نماز کے لئے اٹھ گئے۔

ہمارے رفیق استاذ احمد محمد جمال کابل میں خواتین کی ایک اور نشست میں شریک ہوئے، میں اس وقت غزنی میں تھا اس لئے شریک نہیں ہو سکا، واپسی پر پتہ لگا کہ پردہ، مردوں کے حق طلاق اور تعدد ازدواج کے موضوع پر گرما گرم بحث ہوئی، ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ افغانی خواتین ذہنی اور فکری انتشار و اضطراب کی کس منزل سے گذر رہی ہیں، اور غیر ملکی تہذیب و ثقافت کا پروپگنڈہ اور اس کے اثرات کس حد تک پہنچ چکے ہیں۔؟

علمائے کابل سے گفتگو

دوسری مجلس علماء کے لئے مخصوص تھی، اور چوں کہ سعودی سفارت خانہ کو دینی و مذہبی حلقہ میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس لئے علماء و مشائخ کی بڑی تعداد نے سفارت خانہ کی دعوت قبول کی اور ہر طرح کے تکلف و تصنع سے پاک خالص برادرانہ اور دوستانہ ماحول میں گفتگو ہوئی، اس رات میری گفتگو کا موضوع تھا "اسلام کی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں علماء کی ذمہ داریاں اور قوم سے براہ راست تعلق" میں نے خاص طور سے دو طبقوں ___ عوام اور نوجوانوں کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور اس میدان میں بعض جماعتوں اور تحریکوں کے تجربات بیان کئے، برصغیر کی تبلیغی جماعت اور اس کے طریق کار کا تذکرہ کیا کہ کس طرح اس جماعت نے ہمارے اس دور میں قوم سے براہ راست تعلق قائم کرنے اور عام مسلمانوں کے گھروں، منڈیوں اور بازاروں تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی اور اس کی دعوت دور دراز ممالک تک پھیل گئی، اسی طرح اس نے عوام میں مذہبی شعور اور دینی جذبہ بیدار کرنے اور اللہ کی طرف توجہ، اخلاق و اعمال کی اصلاح، ایثار، اللہ کی راہ میں محنت و مشقت پر آمادہ کرنے کی کامیاب کوشش کی، میں نے کہا کہ عوام کو دینی رہنمائی، اسلامی تعلیم و تربیت اور دین کے مکمل شعور کے بغیر چھوڑ دینا بڑا خطرناک ہوتا ہے، ایسی صورت میں وہ کسی بھی مفسد و ملحد کے لئے تر نوالہ اور خوش گوار گھونٹ ثابت ہو سکتے ہیں، اور بڑی آسانی کے ساتھ تباہ کن تحریکوں اور اسلام دشمن افکار و خیالات کا شکار ہو سکتے ہیں۔

پھر میں نے نوجوانوں اور خاص طور سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نوجوانوں

کی طرف توجہ کرنے پر زور دیا کیونکہ وہی موجودہ نسل کی جگہ لینے والی نسل ہے اور وہی ملک کی قیادت زندگی کی تشکیل، قانون سازی اور تعلیم وتربیت کا رخ متعین کرنے کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے تمام امور ومعاملات کی کلید اور حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھوں میں ہوگی، ان کی اصلاح ملک وقوم کی اصلاح ہے، اور فضائل اسلام پر ان کا پختہ یقین، اسلامی اصولوں اور تعلیمات پر ان کا راسخ ایمان اور دین کے لئے ان کا جوش وجذبہ ہی اس علاقہ میں اسلام کی بقا اور اس کی قوت وشوکت کی ضمانت ہے، اور اسلام کی صلاحیتوں سے ان کی بے اعتمادی، عقیدہ وایمان کی کمزوری، اسلام کے مستقبل اور اس کی قائدانہ صلاحیت سے مایوسی، مغربی تہذیب ہی کو انسان کی ترقی، آزادی اور عزت وسعادت کی انتہا، اور ناقابل تردید حقیقت سمجھنا جس سے انکار و اعراض کی گنجائش نہیں، یہ درحقیقت اسلام کے زوال، زندگی کی رزمگاہ سے اس کے انخلا کا پیش خیمہ اور فکری اور تہذیبی ارتداد ہے، جب یہ طرز فکر کسی ملک پر حملہ آور ہوتا ہے اور اس کی تیز وتند موج چلتی ہے تو نہ عالی شان محلوں کو چھوڑتی ہے، نہ پامال جھونپڑیوں کو، نہ کسان کے کھیتوں کو، نہ کسی عالم کے مدرسہ کو نہ کسی گوشہ نشین عابد وزاہد کی خانقاہ کو میں نے بعض اسلامی ممالک کے دردناک انجام کی مثالیں بھی بیان کیں جہاں علماء نے نوجوانوں پر توجہ دینے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں پہلوتہی کی، ان کو متأثر کرنے میں ناکام رہے، اور ان کو بے مہار چھوڑ دیا کہ الحاد، فساد، کمیونزم، وجودیت اور اباحیت کے داعیوں میں سے جو چاہے، ان کو اپنا شکار بنالے نتیجہ یہ ہوا کہ ان نوجوانوں کے ذہن ودماغ پر ملحد، زندیق، جارحانہ قوم پرستی کے داعی یا دین کے دشمن کمیونسٹ چھا گئے، انھوں نے اپنی سرگرمیوں کے لئے دو میدان منتخب کئے، تعلیم گاہیں اور

فوج اور چند ہی سالوں میں اتنی طاقت حاصل کرلی کہ پورے ملک کو اپنے ڈنڈے سے جدھر چاہیں ہانکتے رہیں، حکومت واقتدار کی کلید اپنے ہاتھ میں لے لیں اور طاقت و قوت کے ہر اس سرچشمہ پر اپنی گرفت مضبوط کرلیں جس سے ملک کی سیاست وحکومت کے طریق کار اور اس کی رفتار پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔[1]

میں نے اس کی بھی وضاحت کی کہ نوجوانوں میں کام کرنے کے لئے، جدید اسلوب، جدید زبان، نوجوانوں کی نفسیات کے گہرے مطالعہ اور ان کو درپیش مسائل و مشکلات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب یہ وصیت پیش نظر رکھنی چاہیے:۔

کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ	لوگوں سے ان کی عقل وفہم کے مطابق گفتگو
اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّکَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول جھٹلا دیئے جائیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ ان کے ذہن و دماغ میں یہ حقیقت ازسرنو اچھی طرح راسخ کردی جائے کہ اسلام زندگی اور قائدانہ صلاحیت سے بھرپور ہے، اور صرف یہی نہیں کہ اسلام زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے، بلکہ زمانہ کی قیادت ورہنمائی کرسکتا ہے، "صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ"

اس مقصد کے لئے ایسا اسلامی لٹریچر مفید ثابت ہوسکتا ہے، جو ان کے ذوق کے مطابق ہو، جو ان کے دماغ کی گرہیں کھول دے مستقل کتابیں تصنیف کرکے

---

[1] شام کسی زمانہ میں جس کی دینی پختگی اور اسلامی روایات سے وابستگی بطور مثال پیش کی جاتی تھی، اس مصیبت کی بہترین مثال ہے۔

شائع کی جائیں یا ملک میں رائج زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا جائے۔

اس مجلس میں استاذ احمد محمد جمال نے بھی گفتگو کی اور بعض اہم پہلو اجاگر کئے، اس کے بعد مذاکرہ شروع ہوا اور بعض ممتاز حاضرین نے تقریروں پر اپنے تأثرات بیان کئے...... ان میں وزارت اطلاعات و نشریات میں شعبہ وعظ و ارشاد کے چیف ڈاکٹر استاذ ...... اور شیخ محمد ہاشم مجددی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے ہماری معروضات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور بعض اہم نکتے واضح کئے پھر مجلس برخاست ہوگئی اور مسرت و اطمینان کا تأثر لئے لوگ واپس ہوئے۔

وزرا اور دوسرے ذمہ داروں سے ملاقاتیں

جن ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی ان میں سب سے اہم وزیر تعلیم جناب محمد یٰسین عظیم اور نائب وزیر ڈاکٹر محمد صدیق ہیں، ان حضرات سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی اور اسلامی ممالک میں تعلیمی رجحانات اور وہاں کی تعلیمی سیاست پر گفتگو ہوتی رہی، وزیر تعلیم نے ہماری باتیں توجہ سے سنیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھیں اپنی عظیم ذمہ داریوں کا احساس ہے، چونکہ ہمارے دورہ کا پروگرام مرتب کرنے اور وفد کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کرنے کا انتظام اصلاً وزارت تعلیم ہی نے کیا تھا، اور یہی وزارت حکومت افغانستان کی طرف سے ہماری میزبان تھی، اس لئے ہم نے وزیر تعلیم اور نائب وزیر تعلیم کا خصوصی طور پر شکریہ ادا اور اپنی ممنونیت کا اظہار کیا، وزارت تعلیم نے ہمارے اعزاز میں ایک دعوت کا بھی اہتمام کیا، جس میں "کلیۃ الشریعۃ" کے اساتذہ نمایاں نظر آتے تھے۔

صدر اعظم (وزیر اعظم) کے خصوصی مشیر استاذ عبد الستار سیرت سے بھی ملاقات

ہوئی وہ مصر کے تعلیم یافتہ اور جامع ازہر کے فارغ ہیں، وہ اہل زبان کی سی تیزی اور روانی کے ساتھ عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ وزارت عدل کے انڈر سکریٹری جناب سمیع الدین زوند اور نیابت عامہ کے انڈر سکریٹری عبدالداد، ہدایت جنرل وقف بورڈ کے ڈائرکٹر استاذ کامل شنواری، افغان جمعیۃ العلماء کے صدر مولانا محمد صدیق کباری وغیرہ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، ان حضرات کے ساتھ وزارت عدل کے عہدہ داروں اور اس کے بعض شعبوں کے سربراہوں میں سے کچھ منتخب افراد بھی تھے، استاذ احمد محمد جمال میرے کابل پہنچنے سے پہلے وزیر اطلاعات سے بھی مل چکے تھے، استاذ عبدالرسول سیاف تمام ملاقاتوں اور اجتماعات میں فارسی زبان میں قدرت اور مہارت کے ساتھ ہماری باتوں کی ترجمانی کے فرائض انجام دے رہے تھے، یہ بات ہم نے خاص طور سے محسوس کی کہ تمام پڑھے لکھے افراد، وزراء اور اعلیٰ عہدہ داران سب فارسی زبان میں بات چیت کرتے ہیں، حالانکہ وہاں کی سرکاری زبان پشتو ہے، سرکاری احکام و اعلانات اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں، سرکاری مراسلات میں یہی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ دعوت نامے بھی اسی زبان میں جاری ہوتے ہیں، لیکن فارسی زبان سب ہی لوگ سمجھتے ہیں، اور علمی اجتماعات اور ادبی مجلسوں میں فارسی ہی استعمال کرتے ہیں، ہمیں بتلایا گیا کہ تحریک پختونستان کے مرکز اور بلوچستان کی سرحد سے ملے ہوئے علاقہ قندھار میں بھی فارسی ہی زیادہ رائج ہے۔

اس دورے میں جن ممتاز شخصیتوں سے تعارف حاصل کرکے خوشی ہوئی اور ان کے ساتھ زیادہ وقت گزرا ان میں مولانا محمد اسلام تسلیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ ان علماء کا نمونہ ہیں، جو دین میں رسوخ و استقامت کے ساتھ ہی جدید افغانستان میں اپنی عزت واحترام اور قدر و منزلت کو بھی باقی رکھے ہوئے ہیں۔

وزارت تعلیم کے بڑے بڑے ذمہ داران اور عہدہ داران ان کا احترام کرتے ہیں، اور مولانا کو ان کا اعتماد حاصل ہے۔

قوم میں علمائے کے اثرات کی روز افزوں کمی اور اس کے نتائج

افغانستان کچھ دنوں قبل علماء اور مشائخ کا ملک تھا، اور اس حد تک علماء کے زیر اثر تھا کہ دوسرے شرقی ممالک میں اس کی مثال نہیں ملتی کسی بھی شخصیت یا حکومت کے لئے علماء کی تصویب وتائید اسی طرح ان کی ناراضگی وناپسندیدگی کا بڑی قیمت تھی، اور اس کے دوررس اثرات مرتب ہوتے تھے اور حکومت اور قوم دونوں کے نزدیک اس کی بڑی اہمیت تھی، علماء کے نعرۂ جہاد ــــ جس کو وہ عام طور پر "غزا" کہتے تھے ــــ کی صدائے بازگشت، سے شہر قصبات اور دیہات گونج اٹھتے اور وہ عوام وخواص کے دلوں اور دماغوں میں نشہ پیدا کر دیتا، انگریزوں سے جنگ، ملک کی آزادی واستقلال کی حفاظت، دینی وملی غیرت کے بقاء بہت سے اسلامی اخلاق وآداب پر قائم رہنا اور اسلام دشمن تحریکوں اور دعوتوں کا مقابلہ انھیں علماء کے اثرات کا رہین منت ہے، اور شاید افغانستان میں شرعی عدالتوں اور اسلامی قوانین کے باقی رہنے کا بھی یہی سبب ہے جبکہ اکثر اسلامی ممالک میں ان کا خاتمہ ہوگیا ہے، اور بلاشبہ افغانی حکومت اس مسئلہ میں مبارکباد کی مستحق ہے۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے کہ سیکڑوں افغانی طالب علم ہمارے یہاں ہندستان کے بڑے مذہبی مدارس اور خاص طور سے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے کیوں کہ افغان بھی ترکوں کی طرح سو فی صدی سنی حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے لیکن ہمیں اس دورہ سے اندازہ ہوا کہ اب وہ نسل ختم ہو چکی ہے یا ختم کے قریب ہے۔

زمانہ کی رفتار اور حالات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ علماء نے اپنا اثر و نفوذ بھی بہت کچھ کھو دیا ہے، اس میں حکومت کے "مدبرانہ" طرز عمل کا بھی بڑا دخل ہے اور یہ بات اس کے حق میں جاتی ہے، حکومت نے گذشتہ تجربات سے یقیناً سبق حاصل کیا ہوگا، اس نے دیکھا کہ علماء امیر امان اللہ خاں کے خلاف کھڑے ہو گئے تو ان کے خلاف بغاوت ہو گئی یہاں تک کہ انھیں ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، اور شاید علامہ اقبال کی بیان کردہ ابلیس کی وہ حکیمانہ وصیت بھی ارباب حکومت کے علم میں آئی جس میں اس نے اپنے مطیع و فرمانبردار رہنماؤں سے کہا ہے۔

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو!

چنانچہ اب یہ دینی غیرت اور افغانی خودداری محسوس حد تک کم ہو گئی ہے افغانی معاشرہ میں زبردست تغیرات رونما ہوئے اور قوم ان کو ہضم کر گئی ان میں کوئی حرکت نہیں پیدا ہوئی، وہاں بے پردگی کا سیلاب آگیا، مغربی تہذیب کی تقلید اور فرنگیت عام ہو گئی، اور وہاں کی زندگی میں کوئی حرکت یا کوئی اضطراب نہیں پیدا ہوا، اس وقت افغانستان ہپیوں کا بہت بڑا مرکز بنا ہوا ہے، کیونکہ حشیش اور دیگر نشیلی اشیاء وہاں بافراط ملتی ہیں، ہم نے خود ان کی بڑی تعداد کو دیکھا وہ جہاز پر ہمارے ساتھ تھے، کابل میں اترے اور ادھر اُدھر پھیل گئے، قوم کے اخلاق اور اختلاط مرد و زن پر پڑنے والے ان کے اثرات صاف ظاہر ہیں، لیکن یہ تمام باتیں اب وہاں کوئی محسوس کی جانے والی ناپسندیدگی یا بے چینی نہیں پیدا کرتیں اور یہ دینی غیرت اور اسلامی نخوت کے زوال ہی کی دلیل ہے، اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ قیادت علماء کے ہاتھوں سے نکل کر سیاستدانوں کے ہاتھوں میں

چلی گئی ہے، جو ہر معاملہ کو اقتصادیات اور سیاست کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور "صورت حال" کے سامنے سر جھکا دینا ہی حقیقت شناسی کا تقاضا سمجھتے ہیں۔

میں نے سنا کہ ہرات اب تک علم و علماء اور مدارس و مساجد کا شہر ہے، وہاں اب بھی علم دین اور علماء بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اور صلاح و تقویٰ کے آثار موجود ہیں، شدید خواہش کے باوجود میں اس تاریخی شہر اور دینی و علمی مرکز کی زیارت نہیں کر سکا یہاں سے بہت سے علماء و مصلحین پیدا ہوئے، مثلاً مشہور عارف و محقق امام عبداللہ انصاری جن کی کتاب "منازل السائرین" کی شرح میں علامہ ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب "مدارج السالکین" لکھی، اور مشہور محدث، فقیہ اور محقق علامہ نورالدین علی بن سلطان محمد جو ملا علی قاری کے نام سے مشہور ہیں۔ (م سنہ ۱۰۱۴ھ)۔

کابل میں مجددی خاندان

دارالسلطنت اور اس کے مضافات میں قدیم علماء و مشائخ کے خانوادہ کے کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں، اور درس و تدریس، اصلاح و ارشاد اور دعوت الی اللہ میں مشغول ہیں، کابل کے مضافات میں مجددی بزرگوں کی ایک خانقاہ "قلعہ جواد" کے نام سے مشہور ہے، اس کے بعض مشائخ کی شہرت افغانستان کے حدود سے باہر تک پھیلی ہوئی تھی، اسی خانوادہ کے ایک بزرگ نورالمشائخ شیخ فضل عمر مجددی تھے، جو "شیر آغا" کے نام سے مشہور تھے، ان کے مریدوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی، جو ہندوستان و پاکستان تک پھیلے ہوئے تھے[1]، ان کے بھائی شیخ محمد صادق مجددی، مشرق وسطیٰ میں افغانستان کے

[1] ۲۵ محرم الحرام سنہ ۱۳۷۶ھ میں انتقال ہوا۔ راقم الحروف نے لاہور اور مکہ معظمہ میں ان کی زیارت کی ہے۔

سابق سفیر اور رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے رکن اپنے علم، صلاح و تقویٰ اور اسلامی مسائل سے دلچسپی کی وجہ سے عرب ممالک میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اس عوامی تحریک میں ان دونوں بھائیوں نے مرکزی اور قائدانہ کردار ادا کیا تھا جس کے نتیجہ میں امیر امان اللہ خاں کو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا اور نادر شاہ تخت نشین ہوئے۔ ہم نے "قلعۂ جواد" کی بھی زیارت کی اور دیکھا کہ خانقاہ طالبین و معتقدین سے بھری ہوئی ہے، مسجد نمازیوں سے آباد ہے، اور مدرسہ میں طلبہ کی کثیر تعداد تحصیل علم میں مصروف ہے، حضرت نور المشائخ کے خلیفہ اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد ابراہیم مجددی کئی بار ہمارے ہوٹل تشریف لائے اور ہم لوگوں پر بڑا کرم فرمایا، اسی طرح اس خاندان کے اور بھی بزرگوں مثلاً شیخ عبدالسلام مجددی وغیرہ سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور برادر عزیز صبغۃ اللہ مجددی کو تو ہم بھول ہی نہیں سکتے، ان کی نوعمری ہی میں ۱۹۵۱ء میں ان سے قاہرہ میں تعارف ہوا تھا، مسجد اقصیٰ میں ان کے دادا شیخ محمد صادق مجددی کی خلوت گاہ میں چند دن گذارے تھے، کابل میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، لمبی لمبی نشستیں رہیں، خوب خوب باتیں ہوئیں اور بیتے دنوں کی یاد تازہ کی جبکہ مسلمان زیادہ باعزت تھے، اور ہمارے اعمال نامے زیادہ پاکیزہ اور روشن تھے، شیخ صبغۃ اللہ مجددی افغانستان جمعیۃ العلماء کے بانی اور اس کی مجلس تاسیسی کے رکن ہیں، بعض وزراء کے زمانہ میں عقیدہ و ایمان میں پختگی اور دعوت اسلامی کی وجہ سے انھیں سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہے، اسی طرح بزرگ و محترم دوست شیخ محمد صادق مجددی کے صاحبزادہ شیخ محمد ہاشم مجددی بھی بہت مانوس ہو گئے تھے، اور ان سے بڑی مفید معلومات حاصل ہوئیں، یہ دونوں وزارت تعلیم سے متعلق ہیں۔

چند اور علمی و دینی شخصیتیں

مجاہد کبیر مولانا سیف الرحمٰن ٹونکی[۱] مہاجر کابل کے صاحبزادے مولوی عبدالعزیز اور ان کے بھتیجے مولوی عزیز الرحمٰن کی ملاقات سے بھی بڑی مسرت ہوئی مسجد پل خشتی کے امام مولوی غلام ربانی سے بھی ملاقات کا موقع ملا یہ دارالسلطنت کی سب سے بڑی جامع مسجد ہے، اور امام صاحب بڑے دلچسپ اور خوش اخلاق آدمی ہیں، اسی طرح دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولوی محمد گل کی خدمت میں بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، افسوس ہے کہ بعض اور بزرگوں کے نام یاد نہیں رہے، انتہائی مشغول پروگرام اور مسلسل آمد و رفت میں لوگوں کے نام نوٹ کرنے اور یادداشت لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

---

[۱] مولانا سیف الرحمٰن صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے، اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر ہندوستان کا رخ کیا، علوم ریاضی کی تعلیم مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور حدیث کی تحصیل مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے کیا، سالہا سال ریاست ٹونک میں مدرسہ ناصریہ میں تدریس کی خدمت انجام دی، اور وہیں سکونت اختیار کر لی کچھ عرصہ فتح پوری میں بھی مدرس رہے، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے خصوصی تعلقات تھے، اور وہ ان کی مجاہدانہ تحریک کے خاص رکن تھے، مولانا نے اسی مقصد کے ماتحت ہندوستان سے ہجرت کی، اور سرحد کے مشہور مجاہد حاجی ترنگزئی کی قیادت میں انگریزوں سے جنگ کی، اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ کابل ہجرت کر گئے، جہاں وہ بعض اہم مناصب پر فائز رہے، پاکستان بننے کے بعد وہ پشاور واپس آگئے، ۷ رجمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ کو اپنے گاؤں متھرا میں وفات پائی، جو پشاور کے شمال میں واقع ہے، مولانا بڑے عالی ہمت، بلند نگاہ، ذہین و ذکی عالم تھے، انگریزوں کی دشمنی میں بہت بڑھے ہوئے تھے، ہندوستان میں ان کے شاگردوں کی اچھی تعداد تھی۔

کابل کی جامع مسجد میں

کابل میں ہمیں ایک ہی جمعہ مل سکا، اور وہ ہم نے جامع مسجد پل خشتی میں ادا کیا، اس میں سعودی سفیر بھی تشریف لائے، مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، یہاں کے رسم کے مطابق ہم نے اور شیخ احمد محمد جمال نے نماز جمعہ سے پہلے تقریریں کیں، میں نے اپنی تقریر میں مشہور حدیث :۔

بدأ الاسلام غريبا وسيعود غريبا كما بدأ فطوبى للغرباء۔ اسلام کا آغاز عالم بیکسی سے ہوا، اور پھر عالم بیکسی میں پہنچ جائے گا تو بیکسوں کو مبارکباد ہو

کی تشریح کی اور تشریح کے دوران قدیم ترین اسلامی ممالک کو درپیش مصائب و مشکلات کی جانب بھی لطیف اشارہ کرتا جا رہا تھا کہ دین و مذہب جن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا وہ بھی اس وقت عقیدہ و ایمان کے سخت امتحان سے گذر رہے ہیں، اور ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، دوسری قوموں کی تقلید اور اسلام بیزاری کے رجحانات نے ان ممالک پر دھاوا بول دیا ہے، دوران تقریر اچانک ایک صاحب نے مسجد کے ایک گوشہ میں زور سے نعرہ لگایا اور ان کو حال آگیا، اس سے عالم اسلام کی موجودہ صورتحال پر غیرت مند مسلمانوں کے رنج و غم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

استاذ احمد محمد جمال نے حدیث " اندرون من المفاس ..... الحدیث اور " الدنیا سوق قامت ثم انفضت "...... الحدیث کی تشریح کی۔

آثار قدیمہ اور باغات

آثار قدیمہ میں سے ہم نے ہندوستان میں مغل سلطنت کے اولوالعزم بانی ظہیر الدین بابر

کی قبر کی زیارت کی، وہ ایک خوبصورت مقام پر گھنے باغ کے درمیان کابل کے قریب ہی ہے بابر کو کابل بہت پسند تھا، تو اللہ نے اس کی آخری آرام گاہ کے لئے کابل ہی کو منتخب کیا۔ ہم پغمان کا مشہور باغ بھی دیکھنے گئے، وہ صحیح معنوں میں دنیا کے مشہور اور بڑے باغات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ اسی انداز پر کشمیر اور لاہور کے شالامار باغ لگائے گئے ہیں، یہ سب ہی مختلف تختوں اور روشوں میں منقسم ہیں، کاریز میر باغ بھی دیکھا یہ بہت لمبا چوڑا اور گھنا باغ ہے، پانی وافر ہے، درخت گھنے ہیں، اور بیچ بیچ میں پختہ سڑکیں ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کے دار السلطنت میں

ہمارا یہ دورہ کابل اور اس کے مضافات کے اداروں، شخصیتوں اور تعلیمی و ثقافتی مراکز تک محدود تھا کیوں کہ وقت کم تھا اور پروگرام بہت، لیکن میں نے وزیر تعلیم اور ان کے سکریٹری سے درخواست کی کہ ہندوستان میں اسلام کا جھنڈا لہرانے اور اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے والے، سکندر اسلام، یمین الدولہ غازی سلطان محمود غزنوی کے دار السلطنت "غزنی" کی زیارت کی بھی اجازت دیں، جہاں تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور شعر و ادب کی نئی تاریخ وجود میں آئی، جو چوتھی صدی ہجری کے آخری اور پانچویں صدی کے ابتدائی ایام میں ترقی اور عظمت و شان میں اندلس کے قرطبہ اور غرناطہ کی بلندیوں تک پہنچ چکا تھا، اور اب عالیشان محلات بازاروں، آبادی کی کثرت اور جدید تمدن کے مظاہر سے زیادہ تاریخوں، کہانیوں، کھنڈرات اور شکستہ در و دیوار میں زندہ ہے، اگر میں محمود غزنوی اور حکیم سنائی کا شہر نہ دیکھ سکا، اور اپنے ملک لوٹ گیا تو میرا دورۂ افغانستان نامکمل رہ جائیگا

اور ایک دیرینہ تمنا دل ہی میں گھٹ کر رہ جائے گی، وزیر تعلیم نے میری تجویز بڑی خوشی سے منظور کرلی اور نائب وزیر تعلیم نے غزنی کے حاکم شہر اور محکمۂ تعلیم کو وفد کے استقبال کی ہدایتیں دیں اور تاکید کی کہ باخبر رہنما اور آثار قدیمہ کے ماہر ساتھ کر دیے جائیں، جو شہر کے قدیم آثار اور تاریخی مقامات دیکھنے میں مدد دے سکیں۔

علمی و تمدنی تاریخ میں غزنی کا حصّہ

سنیچر ۹ رجون کی صبح کو ہم غزنی کے لئے روانہ ہوئے، وہ کابل سے ۱۲۰ کیلو میٹر (۷۵ میل) کے فاصلہ پر ہے، وہاں حاکم شہر اور وزارت تعلیم کے افسران نے ہمارا استقبال کیا تجربہ کار اور باخبر راہنما اور محکمۂ آثار قدیمہ اور کھدائی میں کام کرنے والے چند افراد کو ہمارے ساتھ کر دیا، اور ہم فوراً پرانے شہر کی طرف ہو لئے، وہ موجودہ شہر سے مشرقی جانب چند کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، یہاں اب صرف کھنڈر اور شکستہ در و دیوار رہ گئے ہیں، یہاں کسی زمانہ میں غزنوی سلطنت کا دار السلطنت تھا، جو اس وقت آبادی کی کثرت شہر کی وسعت اور تمدن کی ترقی میں عالم اسلام کے سب سے بڑے مرکز اور سلطنت عباسیہ کے پایۂ تخت دار السلام بغداد کا مقابلہ کر رہا تھا، اور پوری دنیا سے اہل فضل و کمال، علم و ادب کے ماہرین، نادرہ کار دستکار و معمار، فصیح و بلیغ شعراء، متبحر علماء و محققین اولیاء و صلحاء، ذہین و ذکی اور حاضر جواب درباری، حاذق اطباء اور تجربہ کار جنگ جو اور فاتحین اس کی طرف اس طرح کشاں کشاں چلے آرہے تھے، جیسے لوہے کے ٹکڑے مقناطیس کی طرف کھنچتے ہیں، یہاں کے بازار نئی مصنوعات سے بھرے ہوئے تھے، مفتوحہ ممالک سے مال غنیمت وہاں کی قیمتی اور نایاب اشیاء اور نفیس ترین ساز و سامان

اس طرح وہاں پہنچ رہا تھا، جیسے ندی نالوں کا پانی سمندروں میں گرتا ہے، اس کی وجہ سے وہاں ایسی چیزیں جمع ہوگئی تھیں، جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں آتیں۔

آستانۂ غزنوی سے وابستگان و متوسلین میں بدیع الزماں ہمذانی جیسے ادیب شاعر، ابوریحان البیرونی جیسا ریاضیات و فلکیات کا امام، لافانی شاعر فردوسی اور اس کے علاوہ عسجدی، عنصری، اسدی، غضاری، فرخی، منوچہری جیسے ممتاز فارسی شعراء شامل تھے، سلطان جن شعراء کی کفالت کرتے تھے ان کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے۔

غزنی کی بربادی

غزنی پوری ایک صدی تک شان و شوکت اور تمدن کی بلندیوں پر رہا، بیم و رجا، امر و نہی اور نفع و ضرر کا اصل مرکز بنا رہا یہاں تک کہ ابھرتے ہوئے عالی ہمت غوری خاندان (جس میں بعد میں شہاب الدین غوری جیسا مجاہد پیدا ہوا) کے پے در پے حملوں کا شکار ہوگیا اس خاندان کا ایک فرد — علاء الدین حسین بن حسن — اپنے زمانہ کے غزنوی حکمران بہرام شاہ سے خار کھائے ہوئے تھا، کیونکہ بہرام نے اس کے بھائی سیف الدین کو سولی پر چڑھایا تھا، چنانچہ اس نے غزنی پر فوج کشی کی، غزنویوں کو شکست دے کر شہر میں داخل ہوا اور تین دن تک لوٹ مار کا بازار گرم رکھا، شہر میں آگ لگوادی جو پورے شہر میں پھیل گئی، اور خشک و تر سب جل کر راکھ ہوگیا، یہ گلزار شہر کھنڈر میں تبدیل ہوگیا، اور علاء الدین "جہاں سوز" کے لقب سے مشہور ہوا، یہ ۵۴۷ھ کا واقعہ ہے[1] اللہ نے سچ کہا ہے "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ" "زمین اللہ ہی کی ہے، جسے چاہتا ہے، اس کا والی و وارث بناتا ہے"

---

[1] ملاحظہ ہو "البدایہ والنہایہ" جلد ۱۲

ان کھنڈرات سے گذرتے ہوئے ابوالعلاء معری کے یہ اشعار ہمارے ورد زبان تھے ؂

خفف الوطأ ما أظن اديم الأ — رض إلا من هذه الأجساد

وقبيح بنا وان قدم العهد — هوان الآباء والأجداد

سر ان استطعت في الهواء رويداً — لا اختيالا على رفات العباد

(زمین پر چلنے والو! ذرا آہستہ چلو، کیوں کہ میرے خیال میں روئے زمین ان خفتگان خاک کے جسموں کے علاوہ کچھ بھی نہیں، آبا و اجداد کو زیر زمین گئے ہوئے اگرچہ ایک زمانہ گذر چکا ہے، پھر بھی ان کی توہین و تذلیل کوئی اچھی بات نہیں، اگر ہو سکے تو ان فضاؤں میں ہلکے قدموں چلو، اللہ کے بندوں کی بوسیدہ ہڈیوں پر سر پٹکتے ہوئے تو نہ چلو۔)

وہاں کھدائی میں بعض ایسی عمارتوں کے آثار بھی ملے ہیں، جن کی تاریخ سلطان مسعود بن محمود اور ان کے بعد کے لوگوں تک پہنچتی ہے، کھدائی کا کام ابھی جاری ہے، اور بعض ماہرین نے بتایا کہ کہیں دس سال میں اس مدفون اور تباہ شدہ شہر کے آثار سامنے آسکیں گے۔

حکماء، حکام، زاہدوں اور شہنشاہوں کے مزارات پر!

حکیم سنائی[1] کی قبر پر ہم لوگ تھوڑی دیر ٹھہرے، ان کے لئے دعا کی اور فاتحہ پڑھی،

---

[1] حکیم سنائی کا نام مجدود تھا، اور کنیت ابوالمجد تھی، بہرام شاہ غزنوی کے زمانہ کے ہیں، سن وفات میں اختلاف ہے، ۵۲۵ھ، ۵۳۵ھ اور ۵۴۵ھ کی مختلف روایتیں ہیں، یہ صوفیانہ شاعری میں صف اول کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں، سب سے پہلے انہی نے حسن اخلاق، تہذیب نفس اور انسانیت کی عظمت و افتخار کو موضوع سخن بنایا اور اس پر زور دیا، جوش، سرمستی اور اثر انگیزی ان کے کلام کا امتیاز ہیں۔

یہاں یاد آگیا کہ علامہ اقبال نومبر ۱۹۳۳ء میں ان کی قبر پر آئے تو وہاں پھوٹ پھوٹ کر رو دیے اور اسی سے متاثر ہو کر اپنا بلند پایہ قصیدہ[1] کہا جس کا مطلع ہے ؎

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

اور اس کا آخری شعر ہے ؎

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

ہم نے چند اولیاء اللہ اور صالحین مثلاً سید بہلول دانا، سید علی لالا، خواجہ بلغار، اور شمس العارفین کے مزارات کی زیارت بھی کی۔

مجاہد اسلام، فاتح ہندوستان سلطان محمود غزنوی کی قبر پر بھی حاضری دی جن کے لئے بڑی بڑی فوجوں کی قیادت، دوسرے ممالک میں دور تک بے خطر گھستے چلے جانا، پے در پے حملے اور جنگیں ایسی بے حقیقت اور آسان تھیں جیسے آج کے نوجوانوں کے لئے پکنک یا صبح و شام چہل قدمی، انھوں نے ہندوستان میں اسلام کے قدم جما دیئے اور مسلم حکومت کی بنیادیں مستحکم کر دیں، جو مختلف خاندانوں کی شکل میں تقریباً آٹھ سو سال تک باقی رہی، ہم مزار شاہی پر تصویر حیرت بنے کھڑے رہے، یہاں وہ شیر سو رہا ہے جس کی ہیبت سے افغانستان و ہندوستان کے بادشاہوں اور سپہ سالاروں کی نیند اڑ جاتی تھی آج وہ خود محو خواب ہے، محمود کے درباری شاعر فرخی نے اس کی موت پر جدول دوز مرثیہ کہا تھا، اس کے یہ چند شعر صورت حال کی پوری تصویر

---

[1] یہ قصیدہ اقبال کے مجموعۂ کلام "بال جبریل" کے ابتدائی قصائد میں شامل ہے اور اس کی مختصر تشریح اور عمومی تبصرہ "اقبال غزنی میں" کے عنوان سے "نقوش اقبال" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کھینچے ہیں ؎

خیز شاہا! کہ رسولان شہاں آمدہ اند
ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار
کہ تواند؟ کہ برانگیزد ازیں خواب ترا
خفتئ خفتنئ، کز خواب نگردی بیدار
خفتن بسیار اے خواجہ خوئے تو نبود
ہیچ کس خفتہ ندید است ترا زیں کردار

(ترجمہ) اے بادشاہ اٹھ! بادشاہوں کے قاصد آئے ہیں، جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیے اور تحفے لائے ہیں۔
کس کی طاقت ہے کہ تجھ کو اس نیند سے جگا سکے، تو ایسی نیند سویا کہ اب پھر نہ جاگے گا۔
اے آقا! دیر تک سونا تو تیری عادت نہ تھی، کسی نے اس طرح تجھ کو سوتے نہ دیکھا تھا۔[1]

عبرت کا مقام

میں اس دورہ سے شکستہ خاطر اور ملول و غمگین لوٹا، اللہ کی عظمت اور اس کی ابدیت پر ایمان مزید مستحکم ہوگیا، اور انسان کی کمزوری اس کی کوتاہ نظری اور مظاہر سے فریب خوردگی پر یقین تازہ اور پختہ ہوگیا۔ بڑے بڑے دار السلطنتوں سے اعتماد اٹھ گیا، جو آج آبادی کی کثرت

[1] ترجمہ ماخوذ از "شعر العجم"

عمارتوں کے استحکام اور بنیادوں کی مضبوطی پر ناز کرتے ہیں اور جن پر ان کے سربراہوں وہاں کے
بسنے والوں اور ان سے متاثر و مرعوب ہونے والوں کو بڑا اعتماد ہے۔ اسی طرح بڑی آن بان
کروفر، شان و شوکت، لاؤ لشکر، علم و فن، اثر و اقتدار، مضبوط قلعوں، محفوظ برجیوں، عالی شان
عمارتوں اور بڑے بڑے کارخانوں والے طاقتور اور وسیع و عریض ممالک پر سے بھی عقیدہ اٹھ گیا
میں نے سوچا کہ بغداد، غزنی، قرطبہ، غرناطہ، سمرقند اور بخارا کی تباہی و بربادی کے بعد ان موجودہ
دارالسلطنتوں، شہروں، تہذیب و ثقافت کے مرکزوں اور ان حکومتوں کی کیا ضمانت
دی جا سکتی ہے، بادشاہوں کے جاہ و حشم کے اس انجام کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب
بچوں کا کھیل اور اسٹیج کی نقالی ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے بس وہی باقی بتان آذری

اللہ نے سچ کہا ہے "وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ"۔

بیش قیمت کثیر معلومات، مشاہدات اور گوناں گوں تاثرات و احساسات لئے ہم
واپس آ گئے، گیسٹ ہاؤس میں دوپہر کا کھانا کھایا، تھوڑی دیر آرام کیا، اور ظہر کی نماز ادا کی،
موجودہ شہر کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اب یہ صرف
دس ہزار سے پندرہ ہزار کی آبادی پر مشتمل ایک قصبہ رہ گیا ہے، کہاں یہ چھوٹا سا قصبہ اور کہاں
وہ عظیم الشان شہر، رہے نام اللہ کا، رات اور دن کا الٹ پھیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور گردش
روزگار اسی کا تابع فرمان!

ملک محمد ظاہر شاہ اور سردار داؤد خاں

امید تو یہ تھی کہ وفد کو شاہ سے بھی ملاقات کا موقع دیا جائے گا، رابطۂ عالم اسلامی کے

وفود نے جن ممالک کے دورے کئے وہاں کے بادشاہوں یا سربراہان مملکت سے ملاقاتیں کیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ تشریفات کے ذمہ داروں نے اسے پسند نہیں کیا ہم نے سنا کہ شاہ کو بالکل اخیر میں وفد کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے کہا کہ پہلے سے کیوں نہیں بتلایا گیا جب وقت میں گنجائش تھی؟ شاہ قوم سے بالکل الگ تھلگ اپنے محل میں زندگی گذارتے ہیں باہر بہت کم نکلتے ہیں، دوسرے ممالک کے بعض مسلمان بادشاہوں کی طرح ان کی زندگی قومی اور عوامی بالکل نہیں سعودی سفیر شیخ محمد حمد شبیلی نے بتلایا کہ انھوں نے شاہ کو صرف ایک بار دیکھا ہے، جبکہ انھوں نے اپنے اسناد سفارت پیش کئے تھے۔

میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا کہ مغربی تہذیب کے خول اور اس کی ظاہری چمک دمک کی طرف ملک کے بے تحاشا بھاگنے، افغانی عورت کے بے پردہ ہونے اور ملک کے پورے طور سے کمیونسٹ بلاک میں شامل ہونے کے پس پردہ کس کا ذہن کارفرما ہے؟ تو ان لوگوں نے شاہ کے چچا زاد بھائی اور بہنوئی سردار محمد داؤد خاں کا نام لیا، ہم یغمان گئے تو لوگوں نے ان کے محل کی طرف اشارہ کر کے بتلایا کہ یہاں ایک مذہبی مدرسہ تھا، داؤد خاں نے دوسری جگہ منتقل کرادیا، اور خود وہ جگہ اپنے محل کے لئے منتخب کرلی، میں نے محسوس کیا کہ مذہبی رجحان رکھنے والے اور دین پسند لوگ ان کے رجحانات اور سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتے، یہ بھی معلوم ہوا کہ تحریک پختونستان کے اصل روح رواں اور سب سے زیادہ سرگرم و پرجوش داعی یہی ہیں[1]۔

---

[1] کابل سے گئے ہوئے صرف پانچ ہفتے ہوئے تھے، اور ہم لوگ مکہ میں تھے کہ اچانک کابل میں انقلاب کی خبر ملی، شاہ سرکاری دورہ پر اٹلی گئے ہوئے تھے ان کی عدم موجودگی میں فوج نے ان کو برطرف کردیا، معلوم ہوا کہ اس انقلاب کے بانی مبانی سردار محمد داؤد خاں تھے اور وہی سب سے پہلے صدر جمہوریہ منتخب کئے گئے۔

مسلم ممالک کی ذمہ داری

کیمونزم یا لادینیت کی گود میں پناہ لینے، مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر پر ٹوٹ پڑنے اور مغربی قوموں کی ہمرکابی اختیار کرنے کی ذمہ داری صرف افغانستان ہی پر نہیں، بلکہ افغانستان کے ساتھ ہی پورا عالم اسلامی اس سے بری نہیں ہو سکتا، سب جانتے ہیں کہ افغانستان کے ذرائع آمدنی محدود ہیں، یہ کثیر وسائل، معدنی دولت یا سیال سونے والا کوئی سرمایہ دار ملک نہیں، اس کے پاس کوئی بندرگاہ نہیں جس کی وجہ سے درآمد، برآمد کی آزادی سے بھی محروم ہے، ملک کی معاشیات کی بنیاد خشک میوہ جات، بھیڑ کے اون اور اس کی کھالوں کی برآمد ہونے والی محدود آمدنی پر ہے، اور فطری طور سے وہ اپنی مالی دشواریوں پر قابو پانے اور ترقیاتی، تعلیمی اور دفاعی منصوبوں کے لئے ایسے ترقی یافتہ اور دولت مند ممالک سے امداد طلب کرنے پر مجبور تھا جن کے پاس دولت کی فراوانی اور برآمدی مصنوعات کا وافر ذخیرہ ہے ـــــــ اگر اللہ نے بڑے اور دولت مند اسلامی ممالک کو توفیق دی ہوتی کہ وہ افغانستان کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتے اور اس کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے مدد دیتے تو اسے بڑی طاقتوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی بلکہ اپنے اسلامی کردار کی حفاظت کرتا، اسے مزید فروغ دیتا، پورے عالم اسلامی کو مدد دیتا، اس کی قوت و طاقت اور عزت و سربلندی کا سرچشمہ ثابت ہوتا، اور اسلامی غیرت اور دینی جوش و جذبہ سے مالا مال یہ قدیم مسلم قوم فکری و تہذیبی حملوں کا شکار ہونے سے محفوظ رہ جاتی۔

لیکن افسوس ہے کہ دولت مند مسلم ممالک ترقی پذیر ممالک کی امداد و تعاون سے اب تک غافل ہیں، سویت روس اور سرخ چین صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے لئے

سامنے آگئے[1]، افغانستان کے منصوبوں کی تکمیل اور ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے گراں قدر امداد کی پیشکش کی، لازمی بات تھی کہ فکری، ثقافتی اور سیاسی تمام میدانوں میں اس امداد و تعاون کا موافق ردِّ عمل سامنے آتا چنانچہ افغانستان زندگی کے تمام شعبوں میں انہی ممالک کے تعاون سے فائدہ اٹھانے لگا۔

افغانستان علمی اور ثقافتی اعتبار سے عالم اسلام سے بالکل الگ تھلگ رہا، معروف سیاسی اسباب کی بناء پر ہمسایہ مسلم ملک پاکستان سے اس کے تعلقات کشیدہ رہے، راستہ میں پاکستان کے حائل ہونے کی وجہ سے ایک بڑے تہذیبی مرکز ہندوستان سے الگ رہا، مجبوراً اسے قدیم علمی ورثہ پر قناعت کرنا پڑا، جدید علمی و دینی سرگرمیوں اور بیش رفت سے اس کا مضبوط اور براہ راست تعلق قائم نہیں ہوسکا، اور اگر مصر اور اس کا جامع ازہر نہ ہوتا (جہاں آج بھی افغانی نوجوان جاتے ہیں اور فیض حاصل کرتے ہیں، اور مصر میں قیام کے دوران ادب اسلامی اور فکر اسلامی کے جدید افکار و رجحانات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں) تو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی تحریکوں سے افغانستان کا تعلق بالکل ہی منقطع ہوجاتا اور وہ آہنی دیوار کے پیچھے بہت ہی تنگ اور محدود دائرہ میں زندگی گذار رہا ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس وقت جو بھی پختہ فکر و خیال کے نوجوان نظر آتے ہیں، وہ ازہر ہی کے تعلیم یافتہ ہیں، اور مصر میں ایک عرصہ تک قیام کر چکے ہیں۔

---

[1] باخبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ افغانستان نے اول اول امریکا سے امداد کی درخواست کی تھی، لیکن اس نے حد سے زیادہ پس ماندگی کا عذر کر کے امداد سے انکار کر دیا، روس اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور امداد کیلئے پہنچ گیا، اسی طرح امریکہ نے اور بھی مشرقی ممالک کو روسی بلاک میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

سعودی سفارت خانہ کی طرف سے اعزازی دعوت

افغانستان میں سعودی عرب کے سفیر شیخ محمد حمد الشبیلی نے ہوٹل کابل میں — جہاں ہم مقیم تھے — وفد کے اعزاز میں اتوار ۹ رجون کی رات کو ایک پر تکلف عشائیہ دیا مقصد یہ تھا کہ شہر کے معزز و ممتاز افراد سے ملاقات و تعارف ہو سکے، اس میں کابل میں مقیم عرب ممالک کے تقریباً تمام سفراء، افغانی کابینہ میں شامل چند وزراء، کابل کے گورنر، شاہی خاندان کے بعض افراد، کابل یونیورسٹی کے پروفیسر، دیگر علماء و مشائخ، سفارت خانوں سے متعلق بعض عرب عیسائی فضلاء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات مدعو کئے گئے تھے، محترم سفیر نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں مہمانوں کا استقبال کروں، ان سے خطاب کروں اور موقع کی مناسبت سے وفد کے احساسات اور اس کے پیغام کی وضاحت کروں، حسب توفیق الٰہی اپنی باتیں پیش کیں اور رسمی شکریہ ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس قیمتی اور ہر صاحب دعوت انسان کے لئے یادگار موقع سے فائدہ اٹھایا، اس گفتگو میں شکر و سپاس اور جذبات و احساسات کے اظہار کے ساتھ بعض اس سے زیادہ اہم نتیجہ خیز اور مفید باتیں بھی شامل تھیں، اپنی یادداشت پر اعتماد کر کے بعد میں یہ تقریر لکھوادی اور چند صفحات کے بعد قارئین کی نظر سے گذرے گی۔

میرے بعد استاذ احمد محمد جمال کھڑے ہوئے اور مختصر مگر جامع اور بلیغ تقریر کی، افغانی قوم اور حکومت کی جانب سے وفد کے استقبال، مہمان نوازی اور پر خلوص توجہ کا شکریہ ادا کیا، اسی طرح دعوت قبول کرنے والے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، رابطہ عالم اسلامی کے اغراض و مقاصد واضح کئے، اتحاد اسلامی کے لئے شاہ فیصل کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کیا، اور تبلیغ اسلام اور شہادت حق کے لئے علماء کی ذمہ داریاں

بیان کیں۔

پھر لوگ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر مشکور و مسرور اپنے گھروں کو لوٹ گئے، یہ کابل میں آخری ملاقات تھی، اگلی صبح ۱۱ رجون ۷۳ء کو ایران کی طرف سفر کرنا تھا۔

یہاں کابل کی دو تقریریں شامل اشاعت کی جا رہی ہیں، جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، اور اب اگلی ملاقات تہران میں ہوگی۔

—— ⁎ ⁎ ——

افغانی قوم کے انقلاب
اور
ان کی قوت کا سرچشمہ

(یہ تقریر کابل یونیورسٹی کے ہال میں اساتذہ اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد اور سعودی سفیر کی موجودگی میں کی گئی، ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا)

حمد و صلوٰۃ کے بعد:—

محترم سفیر صاحب سعودی عرب، وائس چانسلر، سربراہان شعبہ جات اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ!

اس وقت میرا دل مسرت کے جذبات سے لبریز ہے کہ ان روشن اور تابناک چہروں اور عزیز و محترم حضرات کے سامنے کھڑے ہونے کا زریں موقع نصیب ہوا، عرصہ سے میرے دل میں یہ تمنا کروٹیں لے رہی تھی کہ اس عزیز و محبوب ملک کو قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل کروں جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا بہت کچھ پڑھ چکا تھا، اور میں کہہ سکتا ہوں —— جیسا کہ بعض مواقع پر کہا بھی —— کہ اس کی تاریخ میں، اس کے غزوات اور اس کی فتوحات کی داستانوں میں، میں نے زندگی گذاری ہے،

اس کی جلیلیس اور عبقری شخصیتوں ، فتح وظفر سے بہرہ مند سورماؤں اور غیر معمولی افراد کے حالات وتراجم میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا ہے جنہوں نے علم اور اسلام کے نور سے ان سر بفلک پہاڑوں کے اس پار ہندوستان اور اس کے پڑوسی ملکوں کو منور کیا ، اس لئے سعادت و مسرت کا احساس نہ غیر فطری ہے نہ اس میں کوئی تعجب کی بات ہے ، یہ ایک مسلمان کے دلی جذبات ہیں ، جو ان پہاڑوں کے دامن میں لبنے والے مسلمان بھائیوں سے ملاقات کے وقت ابل رہے ہیں ، مچل رہے ہیں ، دوگونہ مسرت اس پر ہے کہ آپ حضرات نے اس مجلس میں شرکت اور خطاب کا موقع عنایت فرمایا ، میں اپنے دورۂ افغانستان ، اس ملاقات اور اس مجلس میں شرکت کا موقع دینے پر بصمیم قلب سے آپ حضرات کا شکر گذار ہوں ۔

محترم حاضرین ! آپ حضرات اور خاص طور سے ادب اور تاریخ کا ذوق رکھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ افغانی قوم ان قدیم اقوام میں سے ہے جو سیکڑوں اور ہزاروں سال سے آزادی اور عزت و سربلندی کی زندگی گذار رہی ہے ، اللہ تعالٰے نے قدیم زمانہ ہی سے اسے غیر معمولی انسانی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے ، دوستو ! میرا ذوق تاریخی رہا ہے اور میں اس کے اظہار میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا کہ تاریخ ہی کے مطالعہ و تحقیق میں میری عمر گذری ہے یہی میرا محبوب ترین موضوع رہا ہے ، میں اپنے تاریخی ذوق سے مجبور ہو کر آپ حضرات کے سامنے یہ سوال رکھنا چاہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ صدیوں تک افغانی قوم دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہی ، دنیا میں گذرنے والے خیر و شر ، نیک و بد ، فتح و شکست اور ظلم و ستم سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا ، اس جسور و غیور ، قیادت کی مستحق ، زندگی سے بھرپور ،

دست و بازو کی طاقت اور جذبہ کی فراوانی سے بہرہ ور، با صلاحیت اور با عزت قوم کے طویل عرصہ تک دنیا سے کنارہ کش رہنے، اپنے خول میں بند رہنے اور ایک گوشہ میں محدود رہنے کا راز کیا ہے؟ کیا اس عزلت اور گوشہ نشینی کی وجہ یہ تھی کہ افغانستان اور دنیا کے دوسرے ممالک کے درمیان بلند اور دشوار گذار پہاڑوں کی ناقابل عبور دیوار حائل تھی؟ نہیں میرے دوستو! تاریخ کی شہادت تو یہ ہے کہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے برف پوش اور دشوار گذار پہاڑ کبھی بھی غازیوں اور اولوالعزم فاتحین کی راہ کی رکاوٹ نہیں بن سکے، آپ حضرات واقف ہیں کہ یہ ناقابل عبور اور پیچ در پیچ راستے جن میں انسان کی عقل جواب دے جاتی ہے، جو افغانستان کو ہندوستان اور پاکستان سے الگ کرتے ہیں، جب اللہ نے اس امت میں سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین محمد غوری اور احمد شاہ ابدالی جیسے صاحب عزم و ہمت پیدا کئے تو یہ اونچی اونچی چوٹیاں یہ خطرناک گھاٹیاں اور یہ دشوار راستے اسلام کے سیل رواں کے سامنے حقیر تنکے ثابت ہوئے ـــــ پھر کیا یہ قوم قید و بند کی زندگی گذار رہی تھی، اور اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، بارہا یہ قوم اپنی شجاعت کے جوہر دکھا چکی تھی۔ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکی تھی، لیکن اس کے باوجود سرسبز و شاداب چراگاہوں، مویشیوں اور زرخیز کھیتیوں جیسے محدود وسائل زندگی پر قانع کیوں تھی؟ اس کا جواب آپ کے ذمہ ہے۔

پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ تاریخ میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب اسلام اس علاقہ میں آیا تو اچانک یہ قوم ہزاروں سال کی نیند سے بیدار ہو گئی، اور اتنی لمبی چھلانگ لگائی جس کی دوسری قوموں میں مثال نہیں ملتی، اسلام کے زیر سایہ آتے ہی یہ لوگ سب سے

زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ بہادر سب سے زیادہ بلند ہمت، دوربیں، اور فولادی عزائم کے مالک نظر آنے لگے، یہ قوم بزم کائنات میں شامل ہوئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مدفون خزانہ یا کوئی سربستہ راز تھا، جو اچانک منکشف ہوگیا، کیا ان کے جسموں سے بجلی کا کرنٹ چھو گیا تھا، یا کوئی جادو کی چھڑی تھی جس نے آن کی آن میں اس قناعت شعار، ٹھہری ہوئی پرسکون اور عزلت گزیں قوم کو غیور وجسور، ظفرمند اور رواں دواں قوم میں بدل دیا، کیا اس طوفانی ندی کے دہانے پر کوئی بڑی سی چٹان پڑی ہوئی تھی، جو اس کے زور اور روانی کو روکے ہوئے تھی؟

افغانیوں کی زندگی کے انقلاب کا حقیقی سبب اور اس کی شاہ کلید یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اسلام کی برکت سے تین بنیادی اور اہم جوہروں سے نوازا۔

۱۔ طاقتور پیغام اور اس کے اغراض ومقاصد۔

۲۔ نوع انسان، خارجی دنیا اور حقائق اشیاء کے بارہ میں وسیع نقطۂ نظر۔

۳۔ اللہ کی مدد وتائید پر کامل اعتماد اور جدوجہد کے نتائج پر یقین۔

یہ وہ تین عناصر ہیں جن سے قوم کے کردار کی جدید تشکیل ہوتی ہے، اس کو نئی زندگی ملتی ہے، اور وہ نئی تاریخ بناتی ہے، اور اپنی مخفی طاقتوں اور نامعلوم وسائل سے دنیا کو حیران وششدر کر دیتی ہے۔

پہلے اس قوم کے پاس کوئی پیغام یا کوئی بلند مقصد نہیں تھا، ایک چھوٹے سے علاقہ تک محدود تھی، اپنے جانوروں اور مویشیوں میں مگن رہتی تھی، اکثر آپس ہی میں برسرپیکار رہتی تھی، اور جیسا کہ ایک عرب شاعر نے کہا ہے ؎

واحیانا علی بکر اخینا

اذا ما لم نجد الا اخانا

(اور جب جنگجو فطرت کو جوہر دکھانے کے لئے کوئی دشمن نہیں ملتا تو ہم
اپنے بھائی بندوں ہی کو تاکتے ہیں)

اور جنگوں اور آویزشوں کا انجام اخلاقی اور روحانی بے راہگی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، زمانہ جاہلیت میں عرب خانہ جنگی میں مصروف رہتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کو تاخت و تاراج کرتا، ایک شاخ دوسری شاخ پر دھاوا بولتی، اور ایک خاندان، دوسرے خاندان کی تاک میں رہتا، اسی طرح افغانیوں کے سامنے بھی اپنی خون آشام فطرت کی تسکین، اپنی جنگ کی پیاس بجھانے، اور خطر پسند طبیعت کو مطمئن کرنے کے لئے خانہ جنگیوں، چراگاہوں اور جانوروں کے لئے لڑائیوں، قبائلی یا انفرادی غیرت و نخوت کے اظہار یا نام نہاد اور خیالی اہانتوں کا بدلہ لینے کے لئے برسرپیکار ہونے کے علاوہ اور کوئی میدان نہیں ملتا تھا، ایک عرب شاعر نے حقیقت کی صحیح ترجمانی کی ہے۔

النار تاکل نفسہا

ان لم تجد ما تاکلہ

(آگ کو جلانے کے لئے کچھ نہیں ملتا تو خود اپنے آپ کو جلا ڈالتی ہے)

لیکن جب اسلام آیا تو عربوں کے سامنے ایک بلند مقصد اور انسانیت کے لئے ایک طاقتور پیغام آگیا یہی حال افغانیوں کا ہوا، اسلام سے پہلے یہ صرف اپنے لئے زندگی گذار رہے تھے، اور اب اللہ کا یہ فرمان ان کے کانوں کی راہ سے دل میں اتر رہا تھا

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تم بہترین امت ہو، انسانوں کیلئے خاص طور پر

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آل عمران - ۱۱۰)	بنائے گئے ہو، بھلائیوں کا حکم دیتے ہو، برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور ان کے ذہن و دماغ میں یہ بات جاگزیں ہو گئی کہ وہ باغوں اور کھیتوں میں آپ سے آپ اُگ جانے والے خودرو گھاس پھوس نہیں ہیں، بلکہ بجائے خود مقصود و مطلوب ہیں، ان کے ساتھ بلند مقاصد ہیں، ان کی ذمہ داریاں ہیں جد و جہد اور کارکردگی کے نشانات متعین ہیں، ان کے دلوں میں یہ بات جم گئی کہ وہ ایسی امت ہیں، جو انسانوں کے لئے خاص طور سے بنائی گئی ہے، جو لوٹ مار اور خونخواری کے جذبہ کو تسکین دینے کے لئے آپ سے آپ نہیں پیدا ہوئی ہے، تو ان کی زندگی، ان کے خیالات اور رجحانات میں زبردست انقلاب آگیا، اب وہ اپنا مقصد وجود اور اپنی زندگی کی غرض و غایت یہ سمجھنے لگے کہ دنیا کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لئے جد و جہد کریں، اور اس راہ میں قربانیاں دیں، یہاں تک کہ عبادت صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہو جائے، اور انسانوں کو تاریکیوں سے نکال کر اجالے میں لائیں، بندوں کی غلامی سے نجات دلائیں اور خدائے واحد کے آستانۂ عالی پر پہنچائیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعت سے روشناس کرائیں، اور دوسرے مذاہب کی زیادتیوں سے آزاد کرا کے اسلامی عدل و مساوات کے زیر سایہ لائیں۔

حضرات! اس قوم کے پاس کوئی پیغام نہیں تھا، اسلام آیا تو ایک بلند پیغام اور زندگی کا بلند مقصد اس کے سامنے آگیا، اس نے اسلام کے ابدی پیغام کو اپنے سینے سے لگایا ——— اور اسی نے ان میں نئی روح پھونک دی، وہ بدترین جہالت اور گھنگھور

تاریکی میں زندگی گذار رہی تھی، خرافات اور حماقتوں میں بھٹک رہی تھی، ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتا تھا، طاقتور کمزور کو نگل جانے کی کوشش کرتا تھا حقوق پامال ہو رہے تھے، عزتیں لٹ رہی تھیں اور ہر طرح کے جذبات وخواہشات پوری کی جا رہی تھیں کہ اچانک ان کے جسم میں ایک نئی روح دوڑ گئی، ان کے افکار وخیالات، احساسات اور اعصاب پر چھاگئی اور اب وہ نئی قوم تھے، نئے انسان تھے، ان کی زمین وہی تھی، آب وہوا وہی تھی، دست وبازو وہی تھے، لیکن اس جدید پیغام نے انھیں جدید امت بنادیا۔

دوسرا عنصر یہ ہے کہ افغانی بہت تنگ اور محدود زندگی گذار رہے تھے، کائنات اور انسان کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر بہت محدود تھا، انسان کون ہے؟ افغانی انسان ہیں، جو اس علاقہ میں رہتے سہتے ہیں! یہاں کی زبان بولتے ہیں، اس ملک کا لباس پہنتے ہیں، اس کی محبت کے گیت گاتے ہیں، اسی تنگ نقطۂ نظر نے انھیں اس تنگ دائرہ میں محدود کر رکھا تھا۔

اسی طرح زندگی کیا ہے؟ کھانا، پینا، عیش وآرام! قوت وشوکت، حکومت وریاست، وہ اسی طرح زندگی گذارتے تھے، جیسے مچھلیاں یا مینڈک تالابوں میں جیتے ہیں، اسلام سے پہلے عرب، ترک اور ایرانی سب کا یہی حال تھا، اسلام ہی نے ان سب کو اس تنگ وتاریک قید خانہ سے نکالا جیسا کہ ایک عرب قاصد نے شاہ ایران سے کہا تھا۔

لنخرج من شاء الله من ضيق الدنيا	جس کو اللہ توفیق دے اسے ہم دنیا کی تنگی سے
الى سعة الدنيا والآخرة۔	نکال کر دنیا وآخرت کی وسعت میں پہنچا دیں۔

حضرات! آپ کے آباء واجداد انسان کے بارہ میں بہت تنگ نقطۂ نظر رکھتے تھے اس میں اعلیٰ ظرفی نہیں تھی، بلند نگاہی نہیں تھی، اس میں گہرائی نہیں تھی، اسلام نے ان کو

وسیع نقطۂ نظر عطا کیا، تو ان کی نگاہوں میں تمام انسان ایک خاندان اور پوری دنیا ایک گھر ہوگئی، اور رسول اللہ ؐ کا یہ فرمان ان کا عقیدہ بن گیا:۔

کلکم من آدم وآدم من تراب	تم میں کا ہر ایک آدم کی اولاد ہے اور آدم
لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی	مٹی سے بنے ہیں، نہ تو کسی عربی کو کسی عجمی پر
علی عربی الا بالتقوی۔	فضیلت ہے نہ عجمی کو کسی عربی پر مگر تقوی کے
	اعتبار سے۔

پھر ان کا نقطۂ نظر اتنا وسیع ہوگیا کہ وہ نہ جغرافیائی حدود کو تسلیم کرتے تھے، نہ خود ساختہ اور بے دلیل تقسیمات کو۔ مسلمان ان حدود سے نکل کر وسیع کائنات میں آگئے، اور اگر یہ وسیع نقطۂ نظر نہ ہوتا تو وہ بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح صدیوں تاریکیوں میں بھٹکتے رہتے۔

تیسرا عنصر ہے مضبوط و مستحکم اعتماد۔ جب وہ خدائے واحد پر ایمان لے آئے، اس کے رسول اور آخرت پر ایمان لے آئے، قضا و قدر پر ایمان لے آئے اور یہ سمجھ گئے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، اس سے نہ ایک لحظہ پہلے آسکتی ہے، نہ مؤخر ہو سکتی ہے، اور انھوں نے اللہ کا فرمان سنا اور اس کو دل میں بسا لیا کہ:۔

اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ	تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں ہی تم کو موت
وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ	آدباوے گی اگرچہ تم قلعی چونہ کے قلعوں
(النساء۔ ۷۸)	ہی میں ہو۔
اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا	جب ان کا وہ معین وقت آپہنچتا ہے تو
يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً	(اس وقت) ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں

وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (یونس-٤٩)
اور نہ آگے سرک سکتے ہیں۔

اس ایمان نے ان کو خود شناسی اور خود اعتمادی عطا کی وہ یہ سمجھ گئے کہ انسان کی موت اسی وقت آسکتی ہے، جو اللہ نے مقرر کر رکھا ہے، تو انھوں نے اس کا بھی یقین کر لیا کہ دنیا میں ہر ایک کی موت کا وقت مقرر ہے، اور ہر چیز اللہ ہی کے دست قدرت و اختیار میں ہے۔

پھر انھوں نے مزید خود اعتمادی اس آسمانی پیغام سے حاصل کی کہ ان کی حیثیت خدا کی فوج کی ہے، اور وہ اللہ اور اس کے دین کے معین و مددگار ہیں، انھوں نے اللہ کا یہ فرمان سنا:۔

إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ○
(الصّٰفّٰت-١٧٢-١٧٣)

بے شک وہی غالب کئے جاویں گے، اور (ہمارا تو قاعدۂ عام ہے کہ) ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے۔

أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○
(المجادلہ-٢٢)

خوب سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْأَشْهَادُ
(المومن-٥١)

ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس روز بھی جب میں گواہی دینے والے (یعنی فرشتے جو کہ اعمال لکھتے تھے) کھڑے ہوں گے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ
(المنافقون-٨)

(بلکہ) اللہ کی ہے عزت (بالذات) اور اسکے رسول کی (بواسطہ تعلق مع اللہ کے) اور مسلمانوں کی (بواسطہ تعلق مع اللہ والرسول کے)

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران۔۱۳۹)

اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے۔

اور اسی طرح کی دوسری آیتیں ان کے کانوں میں پڑیں تو اس سے ان کے یقین و اعتقاد میں مزید قوت و استحکام پیدا ہو گیا۔

اس موقع پر میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اسلامی لشکر کے ساتھ موجیں مارتے ہوئے دجلہ کے سامنے پہنچے تو ایک لمحہ کے لئے رکے موج بداماں اور طوفان درآغوش دریا کا جائزہ لیا، گرد و پیش پر نظر ڈالی پھر حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف متوجہ ہوئے، اور ان سے مشورہ کیا کہ "بپھرے ہوئے دریا میں گھس پڑیں یا لوٹیں اور اسے عبور کرنے کے لئے پل کا انتظام کریں؟" حضرت سلمان فارسیؓ نے اس وقت جو لافانی جملہ کہا تاریخ نے اسے محفوظ کر لیا ہے، انھوں نے کہا:۔

"یہ دین تازہ اور نیا ہے، اور مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ اس دین کو ضرور غالب کرے گا، اور ابھی اس حد تک نہیں پہنچا ہے، جہاں تک پہنچنا اس کے لئے مقدر کیا گیا ہے، پھر میں کیسے یہ سمجھ لوں کہ اس پیغام کے حامل غرق ہو جائیں گے"۔

حضرت سلمان فارسیؓ کا یہ جملہ اپنے اندر بڑے گہرے معانی و حقائق رکھتا ہے کہ جب یہ دین بالکل نیا اور تازہ ہے تو یہ ضروری ہے کہ دنیا کی تعمیر، کائنات کی قیادت اور انسانیت کی ہدایت و رہنمائی میں اپنا کردار ادا کرے، چنانچہ امیر لشکر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فوج کو حکم دیا کہ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیں اور دریا پار کر جائیں، مورخ طبری کی روایت ہے کہ ایرانیوں نے ان کو دیکھا تو چیخ پڑے "دیواں آمدند" دیواں آمدند" کہ یہ انسان نہیں جن اور بھوت ہیں، یہ اعتماد اور یقین تھا جو ان کے دلوں میں رچ بس گیا تھا

اور ان میں نئی روح ڈال دی تھی۔

افغانی نوجوانو! اور دوستو! آؤ اور اپنی تاریخ پر نظر ڈالو! سلطان محمود غزنوی کس طرح وسیع و عریض ممالک کو فتح کرتا چلا گیا، تاریخ بتلاتی ہے کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور اندرون ملک گھستا چلا گیا، یہاں تک کہ مشرق اور جنوب کی آخری سرحدوں تک پہنچ گیا، حالاں کہ اس کے پاس نہ رسد کا انتظام تھا نہ کمک کا امکان، اس کا مرکز بہت دور تھا، درمیان میں سر بفلک پہاڑ، دشوار گذار راستے اور تنگ گھاٹیاں حائل تھیں، وجہ یہ ہے کہ ان جنگوں اور حملوں کی اس کے نزدیک اتنی ہی اہمیت تھی جتنی اہمیت ایک ماہر اور مضبوط کھلاڑی پیچ یا کھیل کے میدان کو دیتا ہے، وہ اللہ پر کامل اعتماد رکھتا تھا، پھر یہ سمجھتا تھا کہ جہاد عبادت ہے، اور اس راہ میں موت شہادت، اور شہداء مرتے نہیں بلکہ انھیں حیات جاودانی حاصل ہو جاتی ہے، اور ان کے رب کی جانب سے ان کو روزی ملتی رہتی ہے، وہ اس پر سچا اور پختہ ایمان رکھتا تھا کہ وہ اللہ کے پیغام کا حامل اور امین ہے، اور ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کرے گا۔

حضرات! جن عناصر کا میں نے تذکرہ کیا ہے، وہ افراد ہی کی تعمیر میں نہیں بلکہ قوموں کی تشکیل میں بھی زبردست رول ادا کرتے ہیں، شخصیت کی تعمیر کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے اور نفسیات اور تعلیم و تربیت کے ماہرین نے اسے اپنا موضوع بحث بنایا ہے، لیکن میں اس وقت قوموں کے کردار سے متعلق گفتگو کر رہا ہوں، انھیں عناصر نے افغانی قوم کو بلند بالا حیثیت دی جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، جسے شکست نہیں دی جا سکتی، اور جب قومیں شخصیت کی تعمیر کرنے والے ان عناصر سے محروم اور ان قوتوں سے خالی ہو جاتی ہیں، تو انجام شکست و ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر

افغانی قوم اپنی ان طاقتور اور قائدانہ خصوصیات سے محروم نہ ہو جائے اور خدانخواستہ وہ دور پھر واپس نہ آجائے جب وہ اسلام سے ناآشنا اور اسلامی دعوت سے بے بہرہ تھی۔

میں نوجوانوں سے خاص طور سے کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی قوم کے دلوں میں ان عناصر کی جوت جگا دو اور ان کو پروان چڑھاؤ ان کی حفاظت کرو، ضائع نہ ہونے دو کیوں کہ قدیم ترین زمانہ سے قوم وہی ہے، پہاڑیاں اور گھاٹیاں وہی ہیں، آسمان وہی، دریائے کابل ہزاروں سال سے اپنی گذرگاہ پر بہہ رہا ہے، یہاں کی سرزمین جسے اللہ نے بے بہا نعمتوں سے نوازا ہے، وہ بھی وہی ہے، خوش ذائقہ پھل، لذیذ میوہ جات، شیریں پانی یہ ساری نعمتیں اور نوازشیں ہزاروں سال سے بدستور ہیں لیکن اصل مسئلہ قوم کی تعمیر کے عناصر کا ہے، پیغام مقصد زندگی، خود اعتمادی اور کارگزاری کے نشانہ کا ہے تاکہ زندگی کا مقصد متعین ہو صلاحیتوں کے ظہور کے لئے میدان میسر آسکے، حسن وخوبی کا کوئی قابل تقلید نمونہ مل جائے، علامہ اقبال نے اس حقیقت کو پالیا تھا، اور خدا کے حضور میں مسلمانوں کی بے حسی، جمود، معصیت اور بدحالی کی شکایت کی تھی تو جواب ملا کہ یہ لوگ بغیر کسی مقصد اور پیغام کے زندگی گذار رہے ہیں ان کے سامنے کوئی "اسوہ" کوئی نمونہ کامل اور کوئی محبوب نہیں جس کے عشق سے اپنے دلوں کو آباد کریں جس کے حسن وخوبی کے گیت گائیں جس کے نقش قدم کو اپنا نشان راہ بنائیں۔

شبے پیش خدا بگریستم زار	مسلماناں چرا زارند وخوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم	دلے دارند ومحبوبے ندارند

افغانی نوجوانو! خدا نے تمہارے اوپر بڑا فضل فرمایا تمہارے لئے کسی چیز کی کمی نہیں، اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى	اللہ تعالےٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا تاآنکہ

يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (الرعد۔۱۱) وہ خود اپنے آپ کو بدل ڈالیں۔

اللہ اس سے بہت بلند ہے کہ کسی قوم کو عطا کردہ نعمتیں اس سے چھین لے سوائے اس کے کہ قوم ناشکری کی مرتکب ہو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ (ابراہیم۔۲۸)

تو نے نہ دیکھا ؟ جنھوں نے بدلا کیا اللہ کے احسان کا، ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اصل مسئلہ خود شناسی کا ہے، اپنی قدر و قیمت پہچاننے کا ہے، آپ اپنی قدر و قیمت پہچان لیجیے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

قوموں کی زندگی "شخصیت" اور

پیغام کی رہین منت ہے

(یہ وہ تقریر ہے جو سعودی سفارتخانہ کے استقبالیہ جلسہ منعقدہ ہوٹل کابل
۹ رجون ۱۹۷۳ء کی شب میں کی گئی)

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ۔

معزز حضرات! آج کے اس اجتماع اور اس قیمتی موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، سب سے پہلے میں رابطۂ عالم اسلامی کی جانب سے اور اس عزیز و محبوب ملک کا دورہ کرنے والے رابطہ کے وفد کی جانب سے اس پاکیزہ بہترین اور منتخب ترین مجمع کو خوش آمدید کہتا ہوں، اور یہاں کی حکومت اور عوام کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ہمارا پرخلوص اور شاندار استقبال کیا، اور ہمارے ساتھ اعزاز و اکرام اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، اور اس میں کوئی ندرت یا حیرت و استعجاب کی بات بھی نہیں کیوں کہ شرافت اور حسن اخلاق ان کا پرانا جوہر ہے، اور عربوں کا بہت پرانا مقولہ ہے، "الشئی من معدنہ لا یستغرب" (کوئی چیز اپنے منبع و مخرج میں تعجب خیز

نہیں سمجھی جاتی) اور یہ پاکیزہ روح اپنے وسیع وعمیق مفہوم کے ساتھ اس قوم کے قابل فخر کارناموں، اس کی سرفروشی وجانبازی اور اس کی سلطنت وحکومت ہر چیز میں جلوہ گر رہی ہے، اور اسی نے ان کو اپنے ملک کے حدود سے باہر نکلنے، سربفلک پہاڑوں کا سینہ چیرنے پر آمادہ کیا، اور یہ اسلام کی مشعل اور تہذیب وثقافت اور حسن انتظام کی صلاحیتیں لئے ہندوستان تک پہنچی، میں نے اس قوم کی تاریخ میں اس کی عظمت کی داستانوں میں طویل مدت گذاری ہے، افغانستان کے پڑوسی ملک ہندوستان کا شہری ہونے کی وجہ سے ممکن تھا کہ اس سے بہت پہلے میں اس ملک کا دورہ کرتا، لیکن مشیت ایزدی نے اسے تاحال موقوف ومؤخر رکھا شاید اس میں خدا کی کوئی حکمت ومصلحت پوشیدہ ہو۔

محترم حاضرین! زمانۂ قدیم میں عرب اس ملک کو بہت دور دراز کا ملک سمجھتے تھے، اسے مسافت کی دوری اور راستوں کی دشوار گذاری کے لئے بطور مثال پیش کرتے تھے، اور اس سارے علاقہ کو خراسان کہتے تھے، ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

قالوا خراسان اقصی ما یراد بنا

ثم القفول فقد جئنا خراسانا

(لوگوں نے کہا خراسان ہماری آخری منزل ہے، پھر اس کے بعد واپسی ہوگی، تو یہ لو، ہم خراسان پہنچ گئے)

لیجئے ہم لوگ بھی خراسان پہنچ گئے، افغانستان میں داخل ہوگئے، اس کی سرسبز وشاداب سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جسے خدا نے فطری حسن، صحت افزا آب وہوا، اور دوسری بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے، ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

ولما نزلنا منزلا طلّه الندى　　أنيقا وبستانا من النور حاليا
اجدّ لنا طيب المكان وحسنه　　منىً فتمنينا فكنت الأمانيا

یعنی ہم جب بھی کسی شاداب اور خوب صورت جگہ پہنچے جسے شبنم نے تر کر رکھا ہو اور کلیوں نے آراستہ کر رکھا ہو اور اس مقام کی دلکشی و رعنائی نے ہماری خوابیدہ تمنائیں بیدار کر دیں ـــــ تو حاصل تمنا تم ہی نکلے۔

اس ملک میں داخل ہوتے وقت ہمارا بھی یہی حال تھا ہم بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے، بات سے بات نکلتی ہی ہے، اور ایک چیز سے دوسری چیزیں یاد آتی جاتی ہیں، چنانچہ اس خطۂ ارض اور خدا کے عطا کردہ اس کے حسن و جمال نے اس ذات والاصفات کی یاد تازہ کر دی، نئی زندگی جن کی رہین منت ہے، وہ ذات جس نے ہماری زندگی کی کایا پلٹ دی، پرانی دنیا سے نئی دنیا میں پہنچا دیا، اور ہماری زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔

یاد رکھئے! وہ ذات گرامی ہمارے آقا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی آپ سے پہلے ہمارے جسم تھے، روح نہیں تھی محض نام ہی نام تھا، مگر اس نام کا کوئی مصداق نہیں تھا صرف صورت تھی، حقیقت نہیں تھی، اور قومیں تھیں، لیکن ان کی زندگی کا کوئی مقصد اور ان کے پاس نوع انسانی کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا، اس محبوب و محترم ذات نے ان قوموں اور امتوں کو جدید تشخص و امتیازات سے متصف کیا اور نیا پیغام عطا کیا، وہ مضبوط و محبوب اسلامی تشخص جو طاقت و قوت جوانمردی اور حسن اخلاق کے عناصر اور تمام انسانی صفات و کمالات کا جامع ہے، اور پیغام کی بہترین تعبیر و تشریح عرب مسلمانوں کے ایک قاصد نے شہنشاہ ایران یزدگرد کے دربار میں کی شہنشاہ نے قاصد سے سوال کیا تم یہاں کس غرض سے آئے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا۔

"اللہ نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے کہ ہم اس کی مرضی کے مطابق انسانوں
کو انسانوں کی عبادت سے نکال کر خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کے دربار
میں سجدہ ریز کر دیں، اور دوسرے ادیان و ملل کے ظلم و ستم سے نجات
دلا کر اسلام کے عدل و انصاف کی نعمتوں سے ان کا دامن بھر دیں۔"

محترم سفرا اور معزز وزرا!

آپ جن اقوام و ممالک کی نمائندگی کر رہے ہیں، آپ کو ان کا حقیقی اور دیانتدار نمائندہ سمجھتا ہوں، اور میری خواہش ہے کہ آپ اس سے بھی بہتر اور بلند تر ثابت ہوں ساتھ ہی یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ کی ذمہ داریوں اور آپ کے فرائض کا تقاضا ہے کہ آپ ضابطہ کے کام اور متعین ڈھرے کی کارروائی (ROUTEENE) تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔

مشرق آپ سے کارکردگی کے اس سے وسیع میدان اور اس سے زیادہ اہم کام کا مطالبہ کر رہا ہے، آج مشرق کو کتابِ زندگی کے حاشیہ پر اور قافلۂ حیات میں سب سے پیچھے جگہ ملی ہے، مغرب احکام صادر کرتا ہے اور یہ اطاعت گذار ہے، وہ کہتا ہے اور یہ سننے پر مجبور، وہ قیادت کرتا ہے اور وہ اس کے پیچھے چلتا ہے، وہ استاذ ہے، اور یہ شاگرد، اس لئے کہ مشرق مغرب کے دسترخوان کی ریزہ چینی پر زندگی گذار رہا ہے، اس کے پاس نہ کوئی شخصیت ہے نہ پیغام، اور قومیں اور تہذیبیں شخصیتوں اور پیغاموں ہی سے زندہ رہتی ہیں، لہٰذا مشرق کے لئے شخصیت اور پیغام تلاش کرنا ضروری ہے، ایسی شخصیت جس میں قوت ہو، اعتماد ہو جس کے اندر ثبات و استقامت کا جوہر ہو، جس میں جدت طرازی اور ندرت آفرینی کی

صلاحیت ہو جس میں خود اعتمادی وخودشناسی ہو، اسی طرح ایسا پیغام جس میں اخلاص، پاکیزگی، لطف ورحمت، عدل ومساوات اور امن پسندی اور اخوت ہو، آپ کو دور کی کوڑی لانے اور بال کی کھال نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں پیغام آپ کے سامنے ہے، وہ اسلام کا پیغام ہے، جس سے اللہ نے آپ کو سرفراز فرمایا ہے، اور جس کا حامل بنایا ہے، ہمیں کسی نئے دین کی ضرورت نہیں بلکہ اس دین پر نئے ایمان کی ضرورت ہے، ہمیں کوئی نیا پیغام درکار نہیں، بلکہ اسی پیغام کے لئے جوش اور ولولہ کی ضرورت ہے، اسلامی تشخص کو قوت پہنچانے اور اسے مزید ترقی دینے کی ضرورت ہے، تاکہ گردش ایام پیچھے پلٹ جائے، اور پرانی تاریخ پھر دہرائی جائے۔

ذوق جمال اور رعنائی خیال

کی

سرزمین (ایران) میں

ترجمہ

نذر الحفیظ ندوی

ایران کی سیر کی دیرینہ آرزو

میری دیرینہ آرزو تھی کہ علم و دانش کے گہوارہ، اور عربی زبان وادب کے باکمال مصنفین کے مرز بوم، ذوق لطیف، فکر جمیل، اور حسن طبیعت کی نمائندہ سرزمین ایران کی زیارت کروں، جس کو بجا طور سے مشرق کے یونان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اسی آرزو اور خواب میں زندگی گذرتی رہی، اور ایران کے بہار بے خزاں کے تصور میں کھویا رہا، جہاں زندگی زندہ دلی کا نام تھا، جہاں کی فضا مترنم جہاں کی ہر صدا موزوں معلوم ہوتی تھی، جس نے بے چین و بے قرار لیکن سدابہار فطرت پائی تھی، جس کا اظہار انوکھے خیالات، جدت پسند مذاہب اور فلسفوں میں ہوتا رہا، اور جہاں وہ تصوف بھی خوب پھلا پھولا جو معرفت ومحبت سے مخمور اور نئے نئے واردات و تجربات سے معمور تھا۔

لیکن یہ امید اخیر زمانہ میں بر آئی، جبکہ قافلۂ عمر سفر کی بہت سی منزلیں طے کر چکا تھا، اور حسین و جمیل افکار و خیالات سے لطف اندوزی پر حقیقت کی تلاش غالب آچکی تھی، اور شاید یہ اچھا ہی ہوا۔

سفر کی تقریب

رابطہ عالم اسلامی نے عالم اسلام کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کا جائزہ لینے کا ایک جامع پروگرام بنایا تھا، اسی پروگرام سے افغانستان وایران کو دیکھنے کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہو سکی، رابطہ عالم اسلامی کے وفد نے ایران کی علمی وادبی شخصیات، انجمنوں، علمی اداروں اور تاریخی آثار دیکھنے، اور ایران کے سفر کو کارآمد اور زیادہ سے زیادہ مفید بنانے میں ہر ممکن کوشش کی۔

ایرانی وزارت اوقاف کے صدر اور نائب وزیر اعظم ڈاکٹر منوچہر ازمون نے پوری گرم جوشی سے رابطہ کے وفد کی پذیرائی کی، اور اس کے دورۂ ایران کی پوری ذمہ داری وزارت اوقاف کے سپرد کر دی، رابطہ کا وفد ڈاکٹر ازمون کی عنایت وتوجہ، اور ان کے جذبہ کی قدر کرتا ہے، اور ایران کی روائتی فیاضی ومہمان نوازی کا اعتراف اپنا فرض سمجھتا ہے۔[1]

قیام ایران کی مدت

ہمارے وفد کو آٹھ دن کے اندر ایران کے تاریخی آثار دیکھنا، اسلامی تحریکوں اور ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا تھا، لیکن جس کی گھٹی میں فارسی زبان وادب کا ذوق پڑا تھا، ڈاکٹر ازمون سے عرض کئے بغیر نہ رہ سکا کہ ایران آنا اور شیخ سعدیؒ اور خواجہ حافظؒ کا شہر شیراز نہ دیکھنا بڑی محرومی وبد مذاقی ہے، اس لئے کہ شیخ سعدیؒ اور خواجہ حافظؒ اور ان کی

---

[1] وفد کی رہنمائی ورفاقت کے لئے وزارت اوقاف تہران کے سکریٹری ڈاکٹر ابوالقاسم مشیری کا انتخاب کیا گیا تھا، جو ایک تعلیم یافتہ مستعد آدمی ہیں، انگریزی روانی سے بولتے ہیں، عربی سے بھی خاصے واقف ہیں۔

لافانی کتابوں سے ہندوستان کے شرفا کے گھرانے نصف صدی پہلے تک واقف اور دونوں کے ساحرانہ کلام سے آشنا ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ازمون نے ہماری یہ درخواست بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرلی، اور ازراہ کرم شعر و ادب کے شہر شیراز کے ساتھ ہی شاہان صفویہ کے دارالحکومت اور ایرانی فن کاری، اور تاریخی آثار سے معمور اصفہان کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ اس طرح ایران کا یہ دس روزہ یادگار سفر (جس کی ابتدا دوشنبہ ۹ر جمادی الاولی ۱۳۹۳ھ مطابق اار جون ۱۹۷۳ء[1] سے ہوئی تھی) بخیر و خوبی چہارشنبہ ۱۸ر جمادی الاولی ۱۳۹۳ھ مطابق ۲۰ر جون ۱۹۷۳ء کو ختم ہو گیا۔ چونکہ اس سفر کی آخری منزل مکہ مکرمہ تھی، اس لئے ہم تہران سے بیروت ۱۲ر جون کو پہونچ گئے۔

ہمارے قیام کا انتظام تہران کے ایک بڑے ہوٹل پارک ہوٹل (PARK HOTEL) میں کیا گیا تھا۔ ایران کے یادگار سفر کے یہ دس روز تاریخی آثار کے مشاہدے، ممتاز علمی و دینی شخصیات سے ملاقاتوں، تعلیمی اور تبلیغی اداروں کا جائزہ لینے، اور ان کی سرگرمیوں اور جد و جہد سے واقف ہونے، اور استقبالی و خیر مقدمی تقریبات میں گذرے۔

وزراء و علماء سے ملاقاتیں

ہماری ملاقات ایران کی بعض اہم سیاسی شخصیتوں سے بھی ہوئی، جن میں ایرانی وزیر اعظم امیر عباس ہویدا[2]، و استاد کاظم زادہ جو ایران میں ہائر ایجوکیشن کے منسٹر ہیں، اور نائب وزیر اعظم ڈاکٹر منوچہر ازمون قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر سے تہران کے دوران قیام میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں،

---

[1] ایرانی تقویم کے اعتبار سے ۲۱ر خرداد ۱۳۵۲ش۔

[2] امیر عباس ہویدا نے ابتدائی تعلیمی زمانہ بیروت میں گذارا، جہاں انھوں نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے ڈگری لی، اس بنا پر عربی اہل زبان کی طرح بولتے ہیں۔ تقریباً دس سال سے وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہیں۔

پہلی ملاقات خاصی طویل رہی جس میں بے تکلفی وآزادی کے ساتھ گفتگو رہی مختلف علمی و دینی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، آخری ملاقات میں بھی یہی بے تکلفی و سادگی رہی، اور مفید علمی مذاکرہ سے یہ مجلس بھی خالی نہ گئی، اختتام سفر پر ڈاکٹر منوچہر ازمون نے ہلٹن ہوٹل (HILTON HOTEL) میں وفد کے اعزاز میں ایک پرتکلف عشائیہ دیا جس میں متعدد وزرا کے علاوہ شہر کے شرفا اور معززین کی بڑی تعداد شریک تھی۔

ہم نے ایران کے متعدد ممتاز علما اور دینی رہنماؤں سے بھی ملاقات کی، اور ان سے علمی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا، ان قابل ذکر علما میں آیت اللہ العظمیٰ[1] سید محمد کاظم شریعت مداری، آیت اللہ العظمیٰ شیخ حبیب اللہ میلانی، آیت اللہ مرزا محمد خلیل کمرہ ای، تہران میں شاہی مسجد کے امام آیت اللہ سید حسن امامی، اور مشہور ایرانی عالم آیت اللہ محمد تقی الفقمی شامل ہیں، ایرانی فضلا وادبا میں سے علامہ وحیدی[2]، اور کلیۃ الالہیات کے پرنسپل ڈاکٹر محمد محمدی قابل ذکر ہیں، کلیۃ الالہیات میں فقہ شافعی کے استاد پروفیسر شیخ الاسلام، عربی ماہنامہ "الفکر الاسلامی" تہران کے مدیر ڈاکٹر عباس مہاجرانی، آریہ مہر یونیورسٹی تہران کے وائس چانسلر اور شہرۂ آفاق ایرانی فاضل و محقق ڈاکٹر سید حسین نصر، اور دار التبلیغ الاسلامی قم کے سرگرم رکن، اور "الہادی" رسالہ کے مدیر سید ہادی خسرو شاہی سے ملاقات ہوئی، وقت کی تنگی نیز موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ سے ایرانی یونیورسٹیوں کے اساتذہ، اور ممتاز جدید تعلیم یافتہ فضلا سے زیادہ ملاقات نہ ہو سکی۔

---

[1] ایرانی علما وفضلا کے دو طبقے ہیں، تبحر علمی اور دینی حیثیت میں بلند منصب و مقام کے حامل علما کو "آیت اللہ العظمیٰ"، اور دوسرے درجہ کے علما کو "آیت اللہ" سے موسوم کرتے ہیں۔

[2] ناظم مسجد سپہ سالار تہران۔

ایران کے دینی و تاریخی مقامات

ہمیں ایران کے جن مشہور تاریخی شہروں کے دیکھنے کا موقعہ ملا ان میں تہران، قم، اصفہان، شیراز، اور مشہد قابل ذکر ہیں، تہران[1] ایران کا بڑا خوبصورت شہر اور پایہ تخت ہے، قم اپنی علمی و دینی سرگرمیوں کے لئے مشہور ہے، مشہد روحانی مرکز، اور اصفہان شاہان صفویہ کا طویل مدت تک مرکز سلطنت اور اپنے دور عروج میں تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہ چکا ہے اور شیراز تو فارسی شعر و ادب کے لئے ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ کے ایک مسلمان طالب علم، قدیم آثار سے شغف رکھنے والے مورخ اور ملکوں ملکوں، شہروں شہروں گھومنے اور ان کے حالات کا مطالعہ کرنے والے سیاح کے لئے ایران کے تاریخی مقامات میں تسکین کا پورا سامان موجود ہے، چنانچہ ہم نے ان تمام تاریخی آثار کا مشاہدہ کیا جو فنکاری، صناعی، پاکیزہ ذوق اور فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں، اور شاہان صفویہ کے دور عروج کے متمدن اور ترقی یافتہ تہذیب کے نادر شاہکار ہیں، ہم نے ایران کی جدید مصنوعات، اور ان چیزوں کو بھی دیکھا جو سوغات کے طور پر باہر لے جائی جاتی ہیں، اور جن میں ایران نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔

ایران چونکہ اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکا ہے، اس لئے وہاں کثرت سے

---

[1] موجودہ تہران ایران کے قدیم اسلامی دارالسلطنت "رے" کے نواح میں واقع ہے جہاں سے امام فخرالدین رازی، ابوبکر رازی، محمد ابن زکریا رازی، ابوبکر رازی طبیب جیسے سرآمد روزگار فضلا اٹھے تہران کی حیثیت پہلے ایک قصبہ سے زیادہ نہ تھی قاچاریوں کے عہد میں وہ ایران کا دارالحکومت بنا، اب پینتیس لاکھ کی آبادی کا ایک عظیم شہر ہے، جو خاص منصوبہ اور نقشہ کے مطابق آباد کیا گیا۔

مساجد میں بعض مسجدیں تو فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ مثلاً امام علی رضا ابن موسیٰ کاظم کی بہن سیدہ معصومہ کے نام سے ایک شاندار مسجد ہے، جہاں ان کی قبر بھی ہے، یہ مسجد ایرانی زائرین اور سیاحوں سے ہر وقت کھچا کھچ بھری رہتی ہے، دوسری تاریخی مسجد "مسجد سپہ سالار" ہے، جو طرز تعمیر اور نقش و نگار میں شاہکار سمجھی جاتی ہے، ان مسجدوں کے علاوہ شاہی مسجد تہران، جامع مسجد، مسجد گوہر (مشہد) مسجد شاہ عباس صفوی، مسجد شیخ لطف اللہ، جامع مسجد چہار باغ (اصفہان)، اور شیراز کی "مسجد وکیل" قابل ذکر ہے۔ امام علی رضا کا مزار پورے ایران میں سب سے اہم اور بڑے مقبروں میں سے ہے جس کی زیارت کے لئے ایرانی زائرین دور دور سے رخت سفر باندھ کر آتے ہیں، اور ملک کے ہر حصہ سے ان کا دن رات تانتا بندھا رہتا ہے۔

ایران میں بعض اہم علمی اداروں اور دینی مرکزوں کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا، ان اداروں میں تہران یونیورسٹی کا "کلیۃ الالٰہیات و علوم اسلامیہ"، "مرکز التقریب بین المذاہب الاسلامیۃ" اور شہر قم کا علمی مرکز "دار التبلیغ الاسلامی" مشہور و معروف ہیں۔

مجالس مذاکرہ اور استقبالیہ جلسے

اس دس روزہ سفر میں بہت سے خیر مقدمی جلسوں اور تقریبات میں شرکت کا موقعہ ملا، جہاں رابطہ کے وفد کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی، ان جلسوں میں خیر مقدمی تقریریں کی گئیں، اور ارکان وفد نے بھی موقعہ و محل کی مناسبت سے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا، اس سلسلہ کے چار خیر مقدمی جلسے یادگار رہیں، پہلا خیر مقدمی جلسہ علامہ شریعت مداری کے دولت کدہ پر منعقد ہوا، دوسری محفل "دار التبلیغ الاسلامی" قم میں منعقد کی گئی تھی جس میں

متعدد تقریریں ہوئیں، اور قصائد پڑھے گئے، تیسرا استقبالیہ علامہ مرزا محمد خلیل کمرہ ای نے وفد کے اعزاز میں اپنے گھر پر دیا تھا، وفد کے اعزاز میں علامہ حبیب اللہ میلانی کے دولت کدہ پر بھی ایک مختصر تقریب ہوئی، دار التبلیغ الاسلامی، اور علامہ حبیب اللہ میلانی کے یہاں کی محفلوں میں خیر مقدمی اور جوابی تقریریں ہوئیں، لیکن مرزا محمد خلیل کا جلسہ اس اعتبار سے دلچسپ اور قابل ذکر ہے کہ اس محفل میں علامہ اقبال کا شہرۂ آفاق ترانہ ؎

چین وعرب ہمارا، ہندوستان ہمارا

پڑھا گیا، یہ ترانہ عربی کے قادر الکلام شاعر صاوی شعلان نے عربی اشعار کی صورت میں ڈھال دیا ہے، چنانچہ اس عربی ترانہ کو پڑھا گیا، اور اس کا فارسی اشعار میں ترجمہ بھی سنایا گیا، خیر مقدمی تقریر کا جواب رکن وفد استاذ احمد محمد جمال اور راقم سطور نے دیا۔

تہران میں ایک ادارہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مختلف اسلامی مسلک اور فرقوں کے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے، ہم اس ادارہ کو بھی دیکھنے گئے، وہاں شہر کے بعض منتخب علماء اور سربرآوردہ حضرات سے ملاقات ہوئی، اس ادارہ کے خیر مقدمی جلسہ میں آیت اللہ محمد تقی القمی نے تقریر کی جس کا جواب راقم سطور نے دیا۔

طوس کی مردم خیز سرزمین پر

ایران کی عظمت رفتہ کو لافانی بنانے، اور فارسی زبان وادب کو زندگی وتابندگی عطا کرنے، اور قومی شعور کی بیداری میں شہرہ آفاق شاعر فردوسی (م ۴۱۱ھ) کے "شاہنامہ" کا بڑا حصہ رہا ہے، ہر زمانہ میں ایرانی شاہنامہ کے وارفتہ وشیدائی رہے، ایرانی حکومت نے فردوسی کی شاندار یادگار قائم کرکے اس کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ایران کا مشہور شہر طوس[1] اپنی مردم خیزی، باکمال ہستیوں، اور لافانی یادگاروں کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں ممتاز مقام رکھتا ہے، اس شہر نے پانچویں صدی ہجری کے نامور مجدد حجۃ الاسلام امام غزالی، سلجوقی سلطنت کے باکمال وزیر نظام الملک طوسی، شہرۂ آفاق شاعر فردوسی، اور مشہور فاضل نصیر الدین طوسی جیسی نادرۂ روزگار شخصیتوں کو پیدا کیا۔

امام غزالی کی تربت پر

طوس کی فضا میں سانس لیتے ہی پردۂ ذہن پر تاریخ کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں، اور اس عہد کے ترقی یافتہ، اور متمدن زمانہ کی تصویریں متحرک نظر آنے لگتی ہیں، میں اس عہد کے تصور میں کھو گیا، جب طوس علم و عرفان کا سرچشمہ تھا، اور وہاں سے پوری پوری نسل تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو کر کارزارِ حیات میں سرگرم عمل ہوتی تھی، طوس کے تاریخی آثار دیکھتے ہوئے قدرتاً ہمارا ذہن صدیوں، اور نسلوں پر محیط امام غزالی کے کارناموں کی طرف منتقل ہو گیا، اس لئے کہ امام غزالی کی شخصیت، ان کے لافانی کارناموں، اور ان کی تصنیفات کو جو شہرت، اور دوام نصیب ہوا ہے، وہ عالم اسلام کے مشہور مذاہب اربعہ کے بانیوں کے بعد کم ہی علما کو حاصل ہوا ہے، ہم نے جب اپنے رہنما سے امام غزالی کی قیام گاہ، ان کے علمی آثار، اور آخری آرام گاہ کے بارے میں دریافت کیا، تو جواب کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا،

---

[1] مشہور مورخ بغدادی نے طوس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "مراصد الاطلاع" میں لکھا ہے کہ نیشاپور سے طوس کا فاصلہ دس فرسخ ہے (تقریباً اسّی کیلو میٹر ہے) "طابران" اور "نوقان" طوس کے دو مشہور قصبے ہیں، دونوں قصبوں میں مجموعی طور پر ایک ہزار بستیاں ہیں، عباسی خلیفہ ہارون رشید، اور امام علی بن موسیٰ رضا کے مقبرے یہیں کے ایک باغ میں ہیں۔

ہمارے رہنما نے ہمیں مختلف کھنڈروں کے ملبہ اور ویرانوں کے درمیان سے لے جاکر ایک ایسی قدیم عمارت کے سامنے کھڑا کر دیا، جو زمانہ کی ناقدری اور بے مروتی پر نوحہ خواں تھی، ہم جس عمارت کے سامنے کھڑے تھے اس کے متعلق بتایا گیا کہ اس میں ہارون رشید اپنے معتوبین کو قید کر دیا کرتا تھا، قیدی اس میں جانے کے بعد پھر سورج کی روشنی نہیں دیکھ سکتا تھا، اس عمارت کا نام ہارونیہ ہے۔

امام غزالی کی قبر کے متعلق طرح طرح کی بے سروپا کہانیاں مشہور ہیں، تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عیسیٰ صدیق کی کتاب "آرام گاہ غزالی" میرے ہاتھ آگئی، انھوں نے ان افواہوں کا مذاق اڑایا ہے، اور یورپین محققوں میں ڈاکٹر زویمر (DR. ZWEMER) امریکی مستشرقین میں پروفیسر پوپ (PROF. POPE) کی کتابوں کے حوالے، اور متقدمین میں مشہور مصنف تاج الدین سبکی، اور متاخرین میں آقائے علی اصغر حکمت کی تحقیقات سے استدلال کر کے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ امام غزالی کی قبر اسی قدیم افسانوی عمارت ہارونیہ کے پہلو میں موجود ہے۔

ہمارا تاریخی ذوق اور امام غزالی اور ان کی تصنیفات سے دلچسپی و شیفتگی ہمیں کشاں کشاں ان کی قبر تک لے گئی، اندازہ ہوا کہ ابھی حال ہی میں ایک قبر کو درست کیا گیا ہے، ہم جس عمارت میں تھے اس کے پہلو میں امام غزالی کی قبر ہے، لیکن مزار پر کوئی تختی نہ تھی جس سے کچھ معلوم ہو سکتا، گائیڈ نے بتایا کہ عمارت کے اندر ایک کتبہ موجود ہے، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بعض الفاظ مٹ گئے ہیں، بمشکل چند الفاظ پڑھے جا سکے، اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی اور عظمت و کبریائی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، سچ ہے "اللہ بس باقی ہوس" "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ"۔

نادرشاہ افشار

طوس کے دوسرے اہم تاریخی آثار میں نادرشاہ افشار کی قبر ہے۔ نادرشاہ افشار سے کون واقف نہیں۔ اس نے سنہ ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور دارالحکومت دہلی کو اپنی تلوار کی دھار پر رکھ لیا تھا۔ یہ تلوار نیام میں اسی وقت گئی جبکہ دہلی کی سڑکیں خون سے نہا گئیں[1]۔ نادرشاہ مغل بادشاہ محمد شاہ کو شکست دے کر ہندوستان سے وہ شہرۂ آفاق تخت طاؤس ایران لے جانے میں کامیاب ہو گیا جو شاہ جہاں نے نفیس ہیرے جواہرات سے مرصع بنوایا تھا۔

نادرشاہ کا شمار اس عہد کے ایران کے بہترین قائدین اور اعلیٰ درجہ کے سپہ سالاروں میں ہوتا تھا۔ اس نے مشہد کو اپنا دارالحکومت اور ہندوستان پر یورش کے لئے فوجی مرکز بنایا تھا۔ ایرانی حکومت نے کاخ گلستان میں نادرشاہ کے آثار و نوادر کو بڑے قرینہ اور سلیقہ سے ایک میوزیم میں جمع کر دیا ہے۔ اور تصاویر کے ذریعہ اس کے فوجی کارناموں اور عزم و شجاعت کی داستانوں کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ نادرشاہ کا لایا ہوا تخت طاؤس تو اب اصل شکل میں محفوظ نہیں ہے لیکن تہران کے میوزیم میں ایرانی حکومت نے تقریباً ویسا ہی تخت ...

---

[1] دہلی کے اس قتل عام کی وجہ یہ تھی کہ نادرشاہ کی فوج شہر کے مختلف مقامات پر مقیم تھی، شہر کے اوباشوں کو جیسے ہی موقع ملتا وہ نادرشاہ کی فوجوں پر حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لیتے اور فوجیوں کو قتل کر ڈالتے۔ نادرشاہ نے تنگ آکر فوج کو قتل عام کا حکم دیدیا۔ چنانچہ تین دن تک قتل عام ہوتا رہا۔ اس قتل عام میں ایک لاکھ سے زائد انسان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تین دن کے بعد امن و امان کا اعلان کر دیا گیا۔

ملاحظہ ہو "تاریخ ہندوستان"

بنانے کی کوشش کی ہے، اصل ہیرے جواہرات کو بنک کے لاکروں، اور میوزیم میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

خلیفہ ہارون رشید کی یاد

مسلم حکمرانوں، بلکہ مشرق کے سلاطین میں عباسی خلیفہ ہارون رشید کو جیسی افسانوی شہرت اور جتنی غیر معمولی وسیع سلطنت حاصل تھی، وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکی، اس کی سلطنت کی غیر معمولی وسعت کا اندازہ اس کے اس مشہور تاریخی جملہ سے ہوتا ہے، جو اس نے بادل کے ایک ٹکڑے کو مخاطب کر کے کہا تھا "امطری حیث شئت فیأتینی خراجک" (اے بادل تیری جہاں مرضی ہو برس! تیرا خراج میرے ہی پاس آئیگا) تاریخی اعتبار سے یہ تو ثابت ہے کہ ہارون رشید کی قبر طوس میں ہے، لیکن حیرت و تعجب، بلکہ عبرت انگیز بات یہ ہے کہ ہارون رشید کی قبر کا نام و نشان تک نہیں مل سکا، یہ ممکن ہے کہ اس کی قبر[1] امام علی رضا

---

[1] ہارون رشید کی وفات ۱۹۳ھ میں طوس میں ہوئی، اور وہیں اس کی تدفین بھی عمل میں آئی، اس کے چند سال بعد ۲۰۳ھ میں طوس ہی میں امام علی رضا کی وفات کا واقعہ پیش آیا، ابن خلکان نے امام علی رضا کا تذکرہ کرتے ہوئے "وفیات الاعیان" میں لکھا ہے کہ ان کے جنازہ کی نماز مامون رشید نے پڑھائی، جنازہ کے بعد ان کی تدفین اپنے والد کی قبر کے پہلو میں کی، امام علی رضا کی وفات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی موت طبعی تھی، بعض لوگ ان کی موت کا سبب زہر خورانی کو قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ چونکہ مامون نے خلافت کی ذمہ داری ان کے سپرد کرنی چاہی تھی اس لئے بنو عباس نے انھیں زہر دیدیا، طوس امام علی رضا کے مزار کی وجہ سے مشہد کے نام سے مشہور ہو گیا، اور اب طوس کے نام سے کوئی نہیں جانتا، یہ تبدیلی غالباً شاہان صفویہ کے زمانہ میں پیش آئی، اس زمانہ میں یہ پورا منطقہ خراسان کہلاتا تھا، آج بھی یہ علاقہ خراسان ہی کے نام سے مشہور ہے۔

کے مزار کے پہلو میں ہو، لیکن مؤخر الذکر کی دینی اہمیت و عظمت کے سامنے ایک بادشاہ کی حیثیت بے حقیقت ہو کر رہ گئی ہے۔[1]

اصفہان

ایران کے اس سفر میں مشہور تاریخی شہر اصفہان کو بھی دیکھا جو اپنے علماء، ادباء اور باکمال شخصیتوں کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہے۔ مشہور کتاب "حلیۃ الاولیاء" کے مصنف ابونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) "مفردات غریب القرآن" کے مؤلف امام راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ) عالمی شہرت کی حامل کتاب "روایات الاغانی" کے مصنف ابوالفرج الاصبہانی (م ۳۵۶ھ) مستقل فقہی مسلک کے بانی امام ابوداؤد ظاہری (م ۲۷۰ھ) مشہور متکلم اور اصولی ابوبکر محمد بن فورک (م ۴۰۶ھ) محتاج تعارف نہیں۔

اسلامی تاریخ کے آغاز خصوصاً عباسی عہد میں اصفہان علم اور تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکا تھا، لیکن صفویوں کے عہد میں اس کو بڑی غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی، اور ایران کے شہروں میں تو اس کا شمار صف اول کے شہروں میں ہونے لگا۔ صفوی خاندان کے حکمران اور بانی شاہ اسماعیل صفوی کی تاج پوشی و تخت نشینی تبریز میں ہوئی تھی، اس بادشاہ نے سب سے پہلے شیعی مذہب کا اعلان کیا، اور اس کو حکومت کا سرکاری مذہب قرار دیا، اور قزوین کو دارالحکومت بنایا، شاہ اسماعیل صفوی کے جانشین شاہ عباس صفوی

---

[1] مشہد سے کچھ فاصلہ پر نیشاپور کا قدیم شہر واقع ہے، جہاں کی خاک سے خواجہ فریدالدین عطار جیسے عارف اور عمر خیام جیسے شاعر اٹھے۔ افسوس ہے کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے ہم اس کی زیارت نہ کر سکے۔

(م ۱۶۲۹ء) ہوئے، جو صفوی سلاطین میں سب سے زیادہ نامور اور عظیم حکمراں گذرا ہے، اس کے عہد میں قزوین سے دارالحکومت اصفہان منتقل کیا گیا، اصفہان کی جدید تعمیرات، شاندار تمدن، غیر معمولی حسن و جمال شاہ عباس صفوی کا رہین منت ہے، اصفہان کی پرشکوہ، اور نادر روزگار عمارتوں کو دیکھ کر شاہ عباس صفوی کے صاف ستھرے تعمیری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، اصفہان میں ہمارا قیام شاہ عباس صفوی سے منسوب ایسے ہوٹل میں رہا جس کا نام "مہمان سرائے شاہ عباس صفوی" ہے، جس پر کسی ہوٹل، یا گسٹ ہاؤس سے بڑھ کر کسی شاہی محل کا دھوکا ہوتا ہے، شہر میں ہر طرف جا بجا تاریخی آثار، باغ، اور مزارات ہیں، جن کے سب کے دیکھنے کی نوبت نہ آسکی۔

صفویوں نے تقریبًا دو صدی تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی لیکن دنیا کے ہر حکمراں خاندان کی طرح صفوی خاندان بھی زوال و انحطاط سے بچ نہ سکا، انتشار اور بے چینی کے دور کا آغاز ہوگیا، انتشار کے دور میں بھی کوئی مختصر وقفہ ایسا بھی آجاتا تھا جب کوئی طاقت در اور مستحکم قیادت منتشر اور پراگندہ حال ایران کو سنبھالا دے جاتی تھی، لیکن جلد ہی ترکی النسل قاچاریوں کی حکومت قائم ہوگئی، آغا محمد شاہ (م ۱۷۹۷ء) کے عہد میں اصفہان سے دارالحکومت تہران منتقل ہوگیا جس کی اس زمانہ میں کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کے درمیانی عرصہ میں تہران کے تمدن اور رونق میں اضافہ ہوگیا:

"وَلِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ"

شیراز

ہندوستانی ادبیات و محاورں اور شعر و شاعری کے ساتھ شیراز کا نام ہوچکا

شیر و شکر ہو گیا ہے، کہ اس کا الگ کرنا مشکل ہے، سعدی کی شیریں کلامی، اور حافظ کی خوشنوائی نے شیراز آنے سے پہلے شیراز کا مشتاق و گرویدہ بنا رکھا تھا، فارسی کے شاعر نے صحیح کہا ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

اسی شیراز میں حکمت و دانائی، اور محبت و معرفت کے سب سے بڑے ترجمان شیخ سعدی (م ۶۹۱ھ) اور خواجہ حافظ (م ۷۹۳ھ) آسودۂ خاک ہیں، ان میں شیخ سعدیؒ اپنی شہرۂ آفاق کتابوں "گلستان و بوستان" کی وجہ سے بقائے دوام کے خلعت سے سرفراز ہیں، شیخ کے مدفن کو سعدیہ کہا جاتا ہے، شیخ سعدی کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے ہمیں ان کے مشہور دو شعر یاد آ گئے ؎

غرض نقشے است کز ما یاد ماند	کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحب دلے روزے برحمت	کند بر حال این مسکین دعائے

دوسری شخصیت خواجہ حافظ شیرازی کی ہے، جو اپنی عارفانہ و عاشقانہ شاعری کی وجہ سے "ترجمان الغیب" اور سروش غیب بن گئے ہیں، اور جن کی شاعری "ورائے شاعری چیزے دیگر است" کی مصداق ہے، ان کا یہ شعر خود ان کے حسب حال ہے ؎

این ہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود
با حریفان آنچہ کرد آن نرگس مستانہ کرد

ان کے مدفن کو "حافظیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جدید شیراز کی آبادی، اور رونق، اور مساجد کی تعمیر، "زند" خاندان کے حکمراں

کریم خاں کا بڑا حصہ ہے، "زند" خاندان نے صفویوں کے بعد ایران پر حکومت کی تھی، اور شیراز کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔

شیراز اپنی مردم خیزی میں اپنی نظیر آپ ہے، اس خاک سے ایسی باکمال شخصیتیں اٹھیں جو اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھیں، ان شخصیتوں میں جامعہ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس علامہ ابواسحاق شیرازی (م ۴۷۶ھ) امام نحو علی ابن عیسیٰ ابوالحسن الربعی (م ۴۲۰ھ) قابل ذکر ہیں، آخر زمانہ میں تو اس کی خاک سے علامہ صدرالدین شیرازی (م ۱۰۵۰ھ) کی شخصیت پیدا ہوئی جن کی دو کتابیں "الاسفار الاربعہ" "شرح ہدایت الحکمۃ" معروف بہ صدرا[1] عالمگیر شہرت رکھتی ہے۔ دوسری شخصیت امیر فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ) کی ہے، جن کے گہرے اثرات ہندوستان کے نصاب درس میں دیکھے جا سکتے ہیں، تیسری مشہور شخصیت امیر غیاث الدین منصور کی ہے۔

ایران کی سب سے قدیم اور تاریخی یادگار تخت جمشید کو بھی دیکھا، تخت جمشید کو دارائے اول نے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا، آج اس کو ڈھائی ہزار سال ہو رہے ہیں، وہ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، اس کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اور اس زمانہ کی حیرت انگیز انجینئرنگ اور فن تعمیر کے نادر اور شاہکار نمونوں کو دیکھ کر تصویر حیرت بن جاتا ہے، تخت جمشید اپنی غیر معمولی بلندی، بھاری بھرکم پتھروں کو اوپر لے جا کر سلیقہ و صفائی، اور خوبی سے جوڑنے اور معماروں کی غیر معمولی مہارت و صلاحیت کو دیکھ کر بے اختیار اہرام مصر یاد آجاتے ہیں، اور تعمیری ذوق کی داد دینے پر سیاح مجبور ہو جاتا ہے، ایران کی

---

[1] ہندوستان کے نصاب درس میں "صدرا" گیارہویں صدی ہجری سے داخل نصاب ہے، اس کے حصول اور اس میں مہارت کے بغیر طالب علم فارغ التحصیل اور فاضل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

حکومت نے اکتوبر ۱۹۷۱ء میں یہاں ڈھائی ہزار سالہ جشن بڑے تزک و احتشام سے منایا تھا اس جشن میں تمام دنیا کے سربراہان مملکت، وزرائے اعظم، اور سفارتی نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ اس جشن پر جو غیر معمولی اخراجات ہوئے تھے اس کی تفصیلات سن کر الف لیلوی داستان کا گمان ہونے لگتا ہے، تخت جمشید شیراز سے صرف ساٹھ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔

ان تاریخی آثار اور عمارتوں کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ آخر صحرائے عرب کے گلہ بان اور خانہ بدوش کیسے اس متمدن، ترقی یافتہ، اور علم و دانش سے معمور سرزمین کو زیر نگیں کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے خمیر میں قیادت و سیادت تھی اور جو نسل در نسل ہزاروں سال سے حکومت کرتی آرہی تھی۔ دل نے یہی جواب دیا کہ یہ سب ایمان کی طاقت کی کارفرمائی اور اسلامی تعلیمات کا فیض ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عرب کے یہ شتربان تمدن کے مفاسد، اور عیش و تنعم کی زندگی سے کوسوں دور تھے۔

شیراز میں ہمارا قیام "سائرس ہوٹل" میں رہا، سائرس بڑے نامور ایرانی شہنشاہ ہو گزرا ہے۔ اس کو ایران کی عظمت رفتہ کا نشان، اور ایرانی شان و شوکت کا رمز تصور کیا جاتا ہے، قرآن مجید نے سورہ کہف میں ذوالقرنین[1] کے نام سے جس شخص کا تذکرہ کیا ہے، بعض محققین کے نزدیک اس سے مراد سائرس اعظم ہے، یہودی سائرس اعظم کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، اس لئے کہ اسی نے بخت نصر کے چنگل سے یہودیوں کو نجات دلا کر فلسطین انھیں واپس کیا تھا، اسی سائرس اعظم کی یاد میں ایرانی حکومت نے ڈھائی ہزار سالہ جشن بڑے

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "تفہیم القرآن" میں اسی قول کو ترجیح دی ہے لیکن جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں بعض اہل علم کو اس میں کلام ہے، تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

تزک واحتشام سے بنایا ہے، سارس ہوٹل کا شمار ایران کے ان بڑے ہوٹلوں میں ہوتا ہے، جہاں ہوٹل کی تزئین وآرائش، اس کے ملازمین کے لباس اور وضع قطع، اور کھانوں میں بھی قدیم ایرانی تہذیب ومعاشرت کے مظاہرہ کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے، شہر کے دوسرے ہوٹلوں میں بھی اسی وضع قطع کا اہتمام کیا گیا ہے، ہم نے دوپہر کا کھانا سرائے مشیر میں کھایا جو شیراز کے قدیم تمدن کی عکاسی کرتا ہے، ملازمین کا لباس وہی ہے، جو صفویوں کے عہد یا قدیم ایران میں شاہی خادموں کا ہوا کرتا تھا۔

شیراز کے رہنے والے فطرتاً خوش طبع، اور نغمہ وسرود کے شیدائی ہیں، شب کو جب پورا شہر نغمہ وموسیقی، اور رنگ ونور کے سیلاب میں بہہ رہا تھا، میں ہوٹل کی بالکنی پر بیٹھا، یادوں کے سمندر میں غرق، ماضی کی تاریخ، اور زمانہ کے واقعات وانقلابات میں ایسا محو تھا، جیسے میری نگاہوں کے سامنے کسی ڈرامہ کے مختلف مناظر ہوں، جن کے کردار اور مناظر بار بار تبدیل ہو رہے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت میری زبان پر بار بار آرہی تھی:۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ	اور دنیوی زندگی بجز لہو ولعب کے اور
وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ	کچھ بھی نہیں، اور اصل زندگی عالم آخرت ہے
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ (العنکبوت۔۶۴)	اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے۔
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا	کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں جس میں دیکھتے
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	بھالتے کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا
كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ	انجام کیا ہوا وہ ان سے قوت میں بھی بڑھے
وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ	ہوئے تھے، اور انھوں نے زمین کو بھی بویا جوتا
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ	تھا اور جتنا انھوں نے اس کو آباد کر رکھا ہے

لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝

(الروم — ۹)

اس سے زیادہ انھوں نے اس کو آباد کیا تھا، اور ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے لیکر آئے تھے، سو خدا ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ تو خود اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔

ایران کا یہ سفر اپنی نوعیت اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے میرے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا، ایران کی مجلسوں اور محفلوں میں اس کا خوب چرچا ہوا، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ بھی اس کی اشاعت ہوئی، سیر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والے اس جائزہ سے سفر کی ایک اجمالی تصویر اپنے ذہن میں تیار کر سکتے ہیں، اور اس سفر کی تاریخی قدر و قیمت اور علمی و سماجی فوائد کا ایک عام اندازہ کر سکتے ہیں۔

عزیب شہر سخنہائے گفتنی دارد

سفر کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے چند نقوش و تاثرات بھی پیش کر دیئے جائیں، اس لئے کہ اس سفر کی قدر و قیمت محض یہ نہیں ہے کہ یہ مشرق کے ایک اسلامی ملک کی سیاحت اور خیرسگالی کا دورہ تھا، بلکہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے یہ سفر تمام تاریخی سفرناموں، اور آثار قدیمہ کی زیارت، اور جذبۂ خیرسگالی سے زیادہ نتیجہ خیز تھا، ہم اس موقع پر اس سفر کے ان خوشگوار اور تابناک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جن سے ہمیں کام کا ایک نیا میدان، اور امید کی ایک نئی کرن دکھائی دیتی ہے، اور جو مستقبل کے لئے فال نیک بن سکتے ہیں، ہم ایسے پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کریں گے، جو باعث حیرت ضرور ہوں گے، مگر اس کے لئے تھوڑی سی وسیع النظری، اور کشادہ دلی سے کام لینا ہوگا، ساتھ ہی

کہنے والے کے خلوص و حسن نیت پر بھی اعتماد کرنا پڑے گا، ہمارے ایرانی بھائی عالی ظرف، اور شریف النفس ہیں، اس لئے توقع ہے کہ ایران کے دوران قیام میں ہم نے جو محسوس کیا، اور ہمارے جو تاثرات ہیں، ان کے اظہار میں وہ ہماری جرأت و صاف گوئی کا خیر مقدم کریں گے۔

۱۔ ایران کے سفر میں ہم نے جس چیز کا مشاہدہ کیا، اور اس نے ہماری مسرت میں اضافہ کیا، وہ ایرانیوں کا جذبۂ اخوت، اور عالمگیر اسلامی اتحاد و تعاون کا جذبہ ہے، جو وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر متفق ہو کر ظاہر کرنا چاہتے ہیں، ہم صفائی سے اعتراف کرتے ہیں کہ یہاں آنے سے پہلے اتحاد و تعاون کے اس جذبہ، اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ دوستی و تعاون اور بھائی چارہ اور اپنائیت کے اس احساس کا تصور نہیں کرتے تھے، ہمیں اس بات کی توقع نہ تھی کہ ہمارے ایرانی بھائی اس عالمگیر لادینیت کے خلاف متحد ہو کر صف آرائی کی خواہش رکھتے ہیں، جو مذاہب عالم، اور تمام اخلاقی اقدار کے لئے چیلنج ہے، اور جو شیعہ، سنی، حنفی، شافعی، اور مقلد و مجتہد کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتی، ایران میں ہر مجلس کی گفتگو کا آغاز اکثر اسی موضوع سے ہوتا، اور اسی پر اختتام بھی، مجلسوں اور محفلوں میں عام طور سے یہی موضوع سخن ہوتا، بلا شبہ یہ بہت مبارک اور قابل قدر جذبہ ہے، عالمگیر اخوت اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہئے کہ وہ ہمارے ایرانی بھائیوں کے ان جذبات سے فائدہ اٹھائیں اور اسلام کی خدمت میں اس سے کام لیں، اور اس میں مزید ترقی کی کوشش کریں، اس لئے کہ افتراق اور غلو سے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً شدید نقصان پہونچا ہے، ساتویں صدی ہجری میں تو اس اختلاف کی شدت نے تاریخ کے سب سے بڑے سانحہ سقوط بغداد کو جنم دیا[1]، اسی اختلاف اور غلو پسندی نے

---

[1] شیخ سعدی شیرازی نے مسلمانوں کے اس المیہ، اور تاریخ کے اس عظیم سانحہ پر جو دردناک مرثیہ کہا ہے
(باقی ص ۹۸ پر)

مسلمانوں کو یورپ فتح کرنے اور اس کے آخری حدود تک جانے میں رکاوٹ ڈالی۔ اسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں پہلے حکومت کمزور ہوئی پھر آخر میں اس کا چراغ ہی گل ہو گیا۔

۲۔ ایران کے سفر میں دوسری چیز جس سے ہمیں مسرت ہوئی، وہ اسلامی آثار سے دلچسپی عربی زبان سے تعلق، اسلامی کتابوں کی اشاعت، علمار کے کارناموں کے احیار، اور قرآن کی بہترین کتابت وطباعت سے دلچسپی و شیفتگی ہے، ہمیں ایران میں نادر قرآنی مخطوطات کی حفاظت واہتمام، اور قرآن کی اعلیٰ نفیس طباعت دیکھ کر ایرانیوں کے قرآن کی عظمت واحترام کا اندازہ ہوتا ہے، جلسوں وغیرہ میں قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے، خاص طور سے مصری قرار کی تلاوت کی ہوئی آیات ٹیپ ریکارڈ سے سنانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

۳۔ ہمیں ایرانیوں کی دینی غیرت وحمیت دیکھ کر بھی خوشی ہوئی، وہ اسلام کے خلاف سازشی تحریکوں کے بارے میں خاصے حساس واقع ہوئے ہیں، بہائیت[1] جو ایران ہی میں پیدا ہوئی، قانونی طور پر ممنوع ہے، اور بہائی مذہب کے ماننے والوں کو اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے، اسی طرح قادیانیت کو بھی خارج از اسلام فرقہ سمجھا جاتا ہے، اور اس سے دینی حلقوں میں خاصی نفرت پائی جاتی ہے، کمیونزم اور دہریت کے ساتھ دشمنی میں بھی ایرانیوں کی غیرت وحمیت اسلامی ملکوں کے لئے، خاص طور پر پاکستان کے لئے قابل رشک اور قابل تقلید ہے، جس کے ایران سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔

(باقی صـ۹۷ کا) اس کا مطلع یہ ہے ؎

آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمین — بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

[1] ہمیں اپنے سفر کے دوران یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ بہائیوں کے اثرات ایران میں بڑھتے جا رہے ہیں، بعض کلیدی عہدے ان کے ہاتھ میں ہیں، اور بعض اہم سرکاری شخصیتوں پر بہائی ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔

۴۔ حسن اخلاق، شیریں زبانی، مہمان نوازی اور تواضع یہ وہ امتیازی اوصاف ہیں جن کا تجربہ ایک مسلم سیاح کو ایران میں قدم قدم پر ہوتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی بھائیوں اور دوستوں کے درمیان اپنے ہی وطن میں ہے، ہمیں جس شہر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ہم نے وہاں حکومت کے ذمہ داروں، شہر کے شرفا، اور معززین کو اپنا منتظر اور چشم براہ پایا، جب ہم کار کے ذریعہ شہر قُم جارہے تھے، تو اگرچہ ہمیں پہونچنے میں خاصی تاخیر ہوگئی تھی، لیکن ہم نے حکومت کے ذمہ داروں، اور علما، و معززین کو راستہ کے دونوں طرف دھوپ میں منتظر پایا، اس مختصر سفر میں ہمیں اس کا بار بار تجربہ ہوا۔

آخر میں ہم اپنے ایرانی بھائیوں، اور علما، و قائدین کو چند اہم امور کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

۱۔ انسان اور کائنات کی تخلیق کا بنیادی مقصد، اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور صحف سماوی کے نزول کی غرض و غایت یہی تھی کہ اس دنیا میں خدائے تعالےٰ کی عبادت ہو، اور اسی کو لائق پرستش سمجھا جائے، اطاعت شعاری، وفاداری، خشوع و خضوع، اور محتاجی و بندگی کا احساس، یہ وہ صفات ہیں، جو بندے میں خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننے سے پیدا ہوتی ہیں، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ مخلوق کو خالق کے ساتھ قلبی اور جسمانی طور پر مربوط و وابستہ کردیں، اور مخلوق کو جسم و جان کے ساتھ خالق کی طرف متوجہ کردیں، اور اس کی چوکھٹ پر اس کا سر جھکا دیں، انبیاء علیہم السلام کا یہی مقصد حیات یہی تمنا و آرزو، اور ان کی خوش قسمتی و سعادت کا یہی معراج کمال تھی اس سے ان کی روح کو راحت، اور قلب کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی، وہ اس دنیا میں اس لئے تشریف نہیں لائے تھے کہ خالق و مخلوق کے درمیان سدِ راہ بنیں، یا انسانوں کو کسی خاص گھرانے

سے منسلک، اور کسی خاندان کا فرماں بردار یا کسی نسل و خاندان سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کردیں۔

خون اور رشتہ کا تقدس، نسلی و خاندانی غرور، اپنے بیٹوں اور پوتوں کے لئے پیشوائی کی گدی قائم کرجانا، اور ان کے لئے بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈالنا، اور دائمی سیادت و قیادت کی مسند قائم کرنا جو ان کی اولاد میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہے، ان کے مالی مفادات کو صدیوں کے لئے محفوظ کرجانا، اور اس کا انتظام کرجانا کہ ہمیشہ کے لئے ان کے مافوق البشر ہونے کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں جاگزیں رہے، اور ان کے امتیازات کے گُن گائے جاتے رہیں، بانیان سلطنت، حوصلہ مند قائدین، دنیا طلبوں، اور مادی منافع کے پرستاروں کی نفسیات رہی ہیں، جن کی مثالیں بکثرت حکومتوں، اور شاہی خاندانوں کی تاریخ میں زمانۂ قدیم میں ملتی ہیں، انبیاء علیہم السلام ان باتوں سے ماوراء، اور ان کی ذات گرامی ان تمام آلائشوں سے پاک و صاف ہوا کرتی ہے، قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت و دعوت اور ان کی ذات گرامی کی اس خصوصیت کو بڑے بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان فرمایا ہے:۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ ○ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَن تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ○ أَيَأْمُرُكُم	کسی بشر کے لئے یہ روا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکم و نبوت کا منصب عطا فرمائے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے سوا خود میرے بندے بن جاؤ، بلکہ اس کی تعلیم و ہدایت یہ ہوگی کہ تم جس طرح کتاب اللہ پڑھتے پڑھاتے ہو اس کے مطابق ربانی یعنی صرف اللہ کے پورے فرمانبردار بندے بن جاؤ، وہ تم کو ہرگز یہ حکم نہیں دے سکتا کہ

بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ (آل عمران ۷۹ ـ ۸۰)

تم فرشتوں اور نبیوں کو ارباب بنالو کیا وہ تمہارے مسلم ہو جانے کے بعد تم کو کفر کا حکم دے گا۔

اسی بناء پر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی چیزوں سے ہمیشہ چوکنا رہا کرتے تھے، اور کسی ایسی بات کو قطعاً گوارا نہیں کرتے تھے جس سے غیر اللہ کے لئے کسی خدائی تقدیس و تعظیم کا شائبہ بھی نکل سکے، یا عبد و معبود کے درمیان کوئی حائل ہونے کی کوشش کرے، اور اس تعظیم و تقدیس کا کوئی ادنیٰ جذبہ بھی غیر اللہ کے لئے پیدا ہو، خواہ اس کا تعلق انہی کی ذات سے ہو، یا کسی تاریخی آثار، عبادت گاہ یا مزارسے ہو، صحیح حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اے اللہ تو میری قبر کو ایسا بت نہ بنا جس کی پرستش کی جائے، ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہوا جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا"[۱] پھر ارشاد فرمایا:۔ "یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا"[۲] انھوں نے جو کچھ کیا اس سے آپ ڈراتے تھے، ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:۔ "لا تجعلوا قبری عیداً"[۳] (میری قبر کو جشن نہ بنالو) اس موضوع پر احادیث کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔

گذشتہ قوموں کی تاریخ اور تجربات نے یہ بات روز روشن کی طرح واضح کردی ہے کہ جس جماعت اور قوم نے بھی زیارت گاہوں اور قبروں پر جشن منانا شروع کیا، وہ بالآخر حرم مقدس اور مسجدوں سے بے پروا، نماز با جماعت کے اہتمام سے بے تعلق، اور ہر مصیبت و آفت کے وقت خدا کے سامنے جھکنے، اس کی طرف رجوع کرنے، اور

---

[۱] مؤطا۔ [۲] متفق علیہ۔ [۳] ابو داؤد، اس روایت کے راوی اہل بیت کرام ہیں۔

جذبۂ عبودیت و بندگی سے خالی ہو گئی[1]

ایران کے دوران قیام ہم نے مسجدوں کی بہ نسبت زیارت گاہوں کو زیادہ معمور، پر رونق، اور زائرین سے آباد دیکھا جس سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کو ان مزاروں سے غیر معمولی لگاؤ اور قلبی تعلق ہے، جب ایک سیاح سیدنا امام علی رضا کے مزار پر حاضر ہوتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی مزار پر نہیں، بلکہ حرم میں ہے، جو حجاج سے بھرا ہوا ہے، جہاں آہ و بکا کی صدائیں ہر طرف بلند ہیں، مردوں اور عورتوں کے غیر معمولی اژدحام کا عجیب منظر ان مشاہد میں نظر آتا، غیر معمولی تزئین و آرائش، دولت مندوں اور اہل ثروت کے نفیس تحائف، اور مختلف طبقوں کے زائرین کے نذر و نیاز سے پٹے پڑے نظر آئے، حرم مکی اور حرم مدنی، اور اس مزار کے درمیان بمشکل امتیاز کیا جا سکتا ہے، یہی حال تھوڑے فرق کے ساتھ قم میں سیدہ معصومہ کے مقبرہ کا ہے۔

ایران میں مسجدیں عظیم الشان، اور فن تعمیر کے اعتبار سے تو بعض مسجدیں نادر نمونہ ہیں۔ ان کی نظیر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی مشکل سے ملے گی، لیکن مقابر و مزارات کے مقابلہ میں ان کی حالت عبرت ناک ہے، ان مسجدوں میں نہ مقابر و مزارات کی طرح بھیڑ نظر آتی ہے، اور نہ وہ جوش و جذبہ اور قلبی تعلق نظر آتا ہے، جو ان مزارات پر دیکھنے میں آتا ہے، بیشتر "مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" ہم مذہب اثنا عشری میں عبادات کے خصوصی مسائل اور جمع بین الصلاتین اور امامت کے نازک شرائط سے بے خبر نہیں ہیں، ہمکو اس کا اندازہ ہے کہ فقہ جعفری میں بہت سی ایسی گنجائشیں ہیں،

---

[1] رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی تو آپ نماز میں مصروف ہو جاتے۔ (ابوداؤد)

جو نداہب اہل سنت میں نہیں ہیں، اس کے باوجود ہمارا احساس ہے کہ یہ عین ممکن تھا کہ مسجدیں نمازیوں سے اس سے زیادہ معمور نظر آتیں، اور تسبیح وتلاوت کی آواز سے گونجتیں اور مقابر ومزارات کے مقابلہ میں یہاں زیادہ آبادی اور زندگی پائی جاتی، امید ہے کہ ایران کے علماء وفضلاء، اور جو لوگ دینی غیرت سے بہرہ مند ہیں (اور ان کی بڑی تعداد ہے) وہ اس اہم مسئلہ کی طرف اپنی خصوصی توجہ منعطف کریں گے، یہاں تک کہ باہر سے آنے والے کو مساجد ومشاہد کا اتنا فرق نہ محسوس ہوگا۔[1]

---

[1] اس حقیقت وواقعیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے، کہ قبر پرستی، اور دور سے اس مقصد کے لئے خصوصی سفر، سالانہ عرس واجتماع، اور مشرکانہ اعمال ورسوم، برصغیر ہندو پاک ومصر کے اہلسنت میں بھی بکثرت مروج ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ ہر زمانہ میں سلف سے خلف تک ایسے حق گو اور صداقت کے علمبردار علماء بڑی تعداد میں موجود رہے جنھوں نے ان بدعات اور مشرکانہ رسوم ورواج کی کھل کر مخالفت کی اور اس کی بیخ کنی کے درپے رہے اس راہ میں انکو جہلاء وعوام کے غیظ وغضب کا بھی نشانہ بننا پڑا، لیکن وہ ہمیشہ عوام کو ان گمراہیوں سے بچتے رہنے کی تلقین کرتے رہے، اور کسی ملامت اور مخالفت کی پرواکئے بغیر حق گوئی وبے باکی سے توحید خالص کی دعوت دیتے رہے، ان مصلحین سے عالم اسلام کا کوئی خطہ اور تاریخ اسلام کا کوئی وقفہ خالی نہیں رہا مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) کی کتابیں قبر پرستی اور مشرکانہ بدعات ورسوم کی مذمت سے بھری ہوئی ہیں، اثنا عشری حضرات کی اصلاح وتجدید کی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں، ہمیں اس کا علم نہیں کہ شیعہ حضرات میں ایسے داعی ومصلحین امت ہوئے ہیں یا نہیں، جنھوں نے قبر پرستی اور مشرکانہ اعمال ورسوم کے خلاف اعلان جہاد کیا ہے۔ توحید خالص کی دعوت میں کسی مخالفت وخطرہ کی پرواکی ہو۔

اہل بیت کی عقیدت و محبت میں غلو کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ اور ائمۂ اہل بیت کی تصویریں کثرت سے گھروں اور مسجدوں میں نظر آتی ہیں، بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصاویر بھی جابجا آویزاں نظر آئیں، خاص طور پر مسجد سپہ سالار تہران میں وہ بری طرح سے آنکھوں کو چبھیں، یہی تصویریں بت پرستی اور شرک تک لے جاتی ہیں، گذشتہ قوموں نے صلحار و اولیار کی تصویریں اور مجسمے تراش کر بت پرستی کی بنیاد ڈالی تھی، اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کو اس خطرہ سے محفوظ رکھے، اور تمام مشرکانہ رسوم و رواج سے حفاظت فرمائے[1]۔

۲- حضرات ائمہ اہل بیت ہمیشہ تاریکی میں مینارۂ نور، اور ہدایت و رہنمائی کے امام رہے ہیں، اس میں کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا، لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ شیعہ حضرات کا ان ائمہ اہل بیت سے اتنا غیر معمولی جذباتی تعلق، اور اہل بیت کی محبت میں حد سے بڑھا ہوا انہماک عقل و جذبات اور ضمیر پر غالب آگیا ہے، اور ہمارا تاثر یہ ہے کہ اس شیفتگی و شغف نے اس تعلق و محبت کو کسی حد تک مجروح اور کمزور کر دیا ہے، جو نبوت محمدیؐ اور ذات نبوی کے ساتھ ہر مسلمان کا ہونا چاہیئے جس کی وجہ سے اہل بیت نے عزت و شرف کا مقام حاصل کیا، اور وہ ہماری محبت و تعظیم کے مستحق قرار پائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اندرونی ربط و تعلق کا ایک حصہ جو اس ذات گرامی کے ساتھ مخصوص تھا، اس تعلق میں داخل ہو گیا۔

---

[1] صحیح بخاری میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک گرجا گھر کا ذکر کیا، جو انھوں نے (اپنی ہجرت کے موقع پر) ملک حبش میں دیکھا تھا، انھوں نے ان تصویروں کا بھی ذکر کیا جو حضرت (باقی صفحہ پر)

چنانچہ ایران کے اخیر دور کے نعتیہ کلام میں (جس کی کچھ زیادہ مقدار نہیں ہے) وہ جوش و خروش، طبیعت کی روانی، اور مضامین کی آمد نہیں ہے، جو ان نظموں میں نظر آتی ہے، جو مناقب اہل بیت، مرثیے، اور خاص طور پر سیدنا علی مرتضیٰؓ اور حضرت حسینؓ کی مدح و توصیف اور مصائب اہل بیت کے بیان میں کہی گئی ہیں۔ یہ فرق شیعہ حضرات کے یہاں ہر جگہ نعت نبوی، اور اہل بیت کی مدح و توصیف کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے، اردو میں انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے پڑھئے، اور اس کا خود ان کے اور دوسرے شعراء کے نعتیہ کلام سے مقابلہ کیجئے، جو ان کے ہم مسلک، اور ہم مذہب تھے، دونوں میں آمد و آورد، اور اصل و ضمنی کا فرق محسوس ہوگا، کم و بیش یہی فرق سیرت نبوی، اور مناقب اہل بیت میں پایا جاتا ہے، یہی چیز ہم نے ایران میں دیکھی کہ وہاں مشاہد و مقابر سے جو تعلق ہے، وہ مساجد سے نہیں معلوم ہوتا، نجف و کربلا اور عتبات عالیہ کے سفر کا جو شوق ہے وہ حرمین شریفین کی زیارت، اور سفر حج کے سلسلہ میں نظر نہیں آتا۔[1]

(باقی ص۱۰۴ کا) علیہا اور مریم کی وہاں موجود تھیں، اس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا دستور تھا کہ جب کسی نیک آدمی، یا نیک بندہ کا انتقال ہوتا اس کی قبر پر مسجد کی تعمیر کرتے، اور اس مسجد میں اس کی تصویریں لگاتے، اللہ تعالیٰ کے یہاں بدترین خلائق میں ان کا شمار ہے۔

سیرت ابن ہشام کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فتح مکہ کے موقعہ پر خانہ کعبہ میں داخل ہوئے، اور آپ نے فرشتوں وغیرہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویریں دیکھیں تو آپ نے حکم دیا کہ یہ سب تصویریں مٹا دی جائیں۔ (ابن ہشام ج ۴ ص۴۱۳)

[1] ادھر چند برسوں سے ایرانیوں میں حج کے سفر کا شوق، اور ایرانی حجاج کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے، حکومت ایران اور وہاں کے محکمۂ اوقاف نے اپنے حجاج اور زائرین کی سہولت و راحت کے لئے جو انتظامات کئے ہیں، وہ بھی قابل تعریف، اور قابل تقلید ہیں۔

ہوسکتا ہے، ہمارے اثنا عشری بھائیوں میں یہ ردعمل اہل سنت کے بعض علماء اور پرجوش حضرات کے رویہ اور اہل بیت کے حقوق کے اعتراف میں کوتاہی سے ہوا ہو، لیکن یہ بات ردعمل سے کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے، محبت و عقیدت، جوش و جذبہ اور تقدیس و تعظیم کا جو ہالہ اس روحانی مرکز کے گرد بن گیا ہے، اور اس کی مدح و توصیف میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے اس سے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ چیز امامت کو نبوت کا حریف، اور اس کی بہت سی صفات و خصوصیات میں شریک و سہیم نہ بنا دے اگر ایسا ہوا تو پوری زندگی کا دھارا ایک ایسے مرکز کی طرف ہو جائے گا، جو افضل الانبیاء، خاتم النبیین رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو بہلو پروان چڑھے گا۔

اس نقطۂ نظر کے اثرات و نتائج شعر و ادب، اور سوچنے سمجھنے کے انداز میں بھی ظاہر ہونے قدرتی ہیں، میں اس کی تفصیل میں زیادہ جانا نہیں چاہتا، لیکن ہمارے منصف مزاج ایرانی بھائی اپنے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کریں، تو انھیں اس کا اندازہ ہوگا کہ خواہ وہ سو فیصدی ان باتوں سے اتفاق نہ کریں، تاہم یہ باتیں ان کو از سر نو غور کرنے کی دعوت ضرور دیتی ہیں، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا، کہ ائمہ اہل بیت دین اور توحید خالص کی دعوت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح جانشین تھے، وہ ہر اس چیز کے دشمن تھے، جو مخلوق کو اپنے خالق سے غافل کردے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جس دین کو لے کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے، وہ اس کے حق میں سب سے زیادہ غیرت مند تھے، اور کسی ایسی چیز کو قطعاً گوارا نہیں کرتے تھے، جو خالق و مخلوق کے تعلق کو کمزور کردے، یا مخلوق کو مخلوق کے ساتھ مشغول کردے، ان کی دعوت و کوشش مخلوق کے بجائے خالق سے رابطہ قائم کرنے، ظاہر دنیا سے بے رغبتی، زہد و توکل کی زندگی، اور علم نافع کی اشاعت میں مشغولیت تھی۔

مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے، اور شیعہ سنیوں کے درمیان وسیع اور گہری خلیج کو پُر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جذبات وتعلق کے اس کرنٹ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت، اور آپ کی نبوت کی طرف موڑ دیا جائے، اس لئے کہ آپ کی ذات گرامی مسلمانوں کا مرکز توجہ ہے، اور آپ کی نبوت ہی سے یہ چشمہ ابلتا ہے، اور آپ ہی وہ روشن چراغ ہیں، جس نے پوری دنیا کو منور کیا ہے، یہ ایسا عظیم الشان تجدیدی کام ہے، جس کے لئے نہایت قوی الارادہ، صاحب عزم، بلند ہمت مصلحین ومفکرین کی ضرورت ہے، جب کبھی یہ کام پورا ہوگا، اسلام کی فکری، اور تجدیدی تاریخ میں ایک انقلاب انگیز، اور بے نظیر کارنامہ ہوگا، اسی ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر حقیقی اور فطری اسلامی اتحاد قائم ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ ہر کوشش مصنوعی اور غیر فطری ہوگی۔

۳۔ اگر اثنا عشری حضرات خلوص دل سے چاہتے ہیں، کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے سے قریب آئیں، اور وہ صاف دل سے متحد ہوکر ایک مرکز پر جمع ہوں تو انھیں صحابۂ کرام، اور امہات المؤمنین کے بارے میں اپنے طرز فکر میں تبدیلی کرنی ہوگی، اس لئے کہ افراد اور جماعتوں کی محبوب ومحترم شخصیتوں کا جب تک احترام نہ کیا جائے گا، اس وقت تک یک جہتی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دو آدمی ایک مقصد کے لئے جوش وخلوص، صاف دلی اور جذبہ وتعاون سے آپس میں مل بیٹھیں، لیکن ایک ساتھی دوسرے ساتھی کے مثالی محبوب ومحترم، اور محبت وعقیدت کی مرکزی شخصیت کو نامناسب الفاظ میں یاد کرے، طنز وتشنیع، اور بے سروپا الزامات لگانے کو خدا کے یہاں تقرب کا ذریعہ خیال کرے، ہم میں سے ہر شخص کو اس کا تجربہ ہے، جب اساتذہ وشیوخ، اور آباء واجداد کے بارے میں ہمارا یہ تجربہ ہے تو بھلا ان پاک نفوس کے بارے میں ہمارا کیا حال ہوگا جن کو

انسان اپنے آبا و اجداد، اور اساتذہ و شیوخ سے کہیں زیادہ افضل اور برتر سمجھتا ہے، اور ان پر
اپنی جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، اور ان کو دین کا سچا خادم، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ
وسلم کا جان نثار فدائی خیال کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ صحابۂ کرام نے خدا کی راہ میں جہاد کیا ہے،
اور دینی دعوت کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، اور دنیا کی زندگی میں زہد و تقشف
اور ایثار و قربانی کے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

اس جذباتی پہلو سے قطع نظر اس مسئلہ کی بہت بڑی تبلیغی اہمیت، اور علمی قدر و قیمت
ہے، لوگ ہمیشہ دعوت کی صداقت، اور کسی مذہب کی تعلیمات کی خوبیوں کا فیصلہ اس سے
کرتے ہیں کہ اس دعوت نے کیسے اخلاقی نمونے، اور عملی مثالیں پیش کیں، اس دعوت نے اپنے
ابتدائی دور میں کس طرح کی نسل تیار کی، اور آدم گری، و مردم سازی کا کیا کمال دکھایا، جس داعی دعوت
کو اپنی دعوت و تربیت میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی؟ اساتذہ و معلمین، قائدین و مصلحین، اور ماہرین فن
صناعوں کی کامیابی کا بھی ہمیشہ سے یہی پیمانہ رہا ہے، اگر ان کو اپنی کوششوں میں معتدبہ کامیابی
حاصل ہوئی، اور انھوں نے خاصی تعداد میں ایسے لوگ تیار کئے جن سے ان کے کمال فن کا اظہار ہوتا تھا
اور ان کی محنت ٹھکانے لگتی تھی، تو ان کی فنی مہارت، اور ان کا امتیاز بے چون و چرا تسلیم کر لیا گیا،
اور ان کو اس فن کا امام اور اپنے مقصد میں کامیاب مان لیا گیا، لیکن اگر ان کی کوششوں کے
نتائج برائے نام، اور کامیابی بہت محدود پیمانے پر ہوتی ہے، یا اپنے شاگردوں، اور ماننے والوں
کی تعلیم و تربیت میں ان کی جد و جہد ضائع ہو جاتی ہے، اور یہ شاگرد اپنے اساتذہ اور مربیوں
کے اس دنیا سے جاتے ہی ان کی جد و جہد کو ناکام ثابت کر دیتے ہیں، اور ان کی تربیت کے
اثرات بہت جلد زائل ہو جاتے ہیں، تو ان اساتذہ اور مربیوں کو اپنی تعلیم و تربیت کی مہم
میں ناکام سمجھا جاتا ہے۔

اس موقعہ پر لوگ یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوتے ہیں، کہ جب یہ دعوت اپنے سب سے بڑے داعی کے ہاتھوں اپنے دورِ عروج میں کوئی دیرپا اور گہرے نقوش مرتسم نہ کرسکی اور جب اس دعوت پر ایمان لانے والے ابتدا ہی میں اسلام کے وفادار اور امین نہ رہ سکے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس صراطِ مستقیم پر صحابۂ کرامؓ کو چھوڑا تھا ان میں سے معدودے چند آدمی ہی اس پر گامزن رہ سکے، تو ہم کیسے تسلیم کرسکتے ہیں کہ اس کے اندر نفوس کے تزکیہ کی صلاحیت ہے، اور وہ انسان کو حیوانیت کی پستی سے نکال کر انسانیت کی بلند چوٹی تک پہونچا سکتی ہے۔

دعوت و تبلیغ کی ایک اہم ضرورت، نیز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی سیرت و تاریخ کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحابۂ کرامؓ کے محاسن کا اعتراف کریں، ان کے کارنامے کی عظمت و اہمیت، ان کی وفاداری، باہمی محبت، تعاون علی الحق کے نقوش کو اجاگر کریں، اور اس تابناک تاریخ کا یہ روشن ورق دنیا کے سامنے پیش کریں ــــ ان کی بھول چوک اور بشری کمزوریوں کی حیثیت تاریخ کے صاف شفاف صفحہ پر ایک سیاہ نقطہ سے زیادہ نہیں، صحیح منطق اور عقل سلیم بھی اس موقف کو قبول کرتی ہے اور قرآن مجید اور مستند تاریخ سے بھی یہی موقف درست ثابت ہوتا ہے، قرآن مجید نے بھی سابقین اولین، اور سلف صالحین کے متعلق اسی روش کو قابل تعریف قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:ــ

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ	اور واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد کہتے
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا	ہوئے اے رب بخش ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو
بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا	جو ہم سے پہلے ایمان میں داخل ہوئے، اور نہ رکھ

غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (الحشر ۱۰)

ہمارے دلوں میں بیر ایمان والوں کا اے رب! تو ہی نرمی والا مہربان ہے!

گذشتہ قوموں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ان کے انبیاء علیہم السلام کے حواری اور رفقاء مخلوق خدا میں سب سے بہترین لوگ ہیں، یہ قومیں اپنے پیغمبروں کے حواریوں اور رفیقوں کی محبت و عقیدت میں معروف مشہور تھیں، اس لئے ہمیں صحابہؓ کرام سے اور زیادہ محبت و عقیدت ہونی چاہئے، جو اس نبی کے رفیق و حواری ہیں، جس نے اس دنیا پر سب سے زیادہ گہرا اور لافانی اثر ڈالا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الجمعہ ۲)

وہی ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں میں ایک رسول انھیں میں کا، وہ پڑھ کر سناتا ہے، ان کو اللہ کی آیات، اور سنوارتا ہے، اور سکھلاتا ہے، ان کو کتاب و حکمت، اور اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (الفتح ۲۸)

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت دی اور سچا دین لے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور اللہ کافی گواہ ہے۔

اگر ہم مختلف مسلک کے لوگوں کو قریب کرنے کے لئے خلوص دل سے کوشش کرنا چاہتے ہیں، تو پھر یہ کوشش ٹھوس اور فطری بنیاد پر ہونی چاہئے، اس نفسیاتی اور فطری راستہ کے علاوہ جو کوشش بھی کی جائے گی، وہ ناکام اور غیر فطری ہوگی، ہم نے ایک موقع پر علامہ تقی القمی (جو اس مقصد کے لئے تیس۳۰ سال سے کام کر رہے ہیں) کی مجلس میں عرض کیا تھا کہ

ہمارے یہاں اردو کی ایک مثل ہے کہ "تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی" میں اس میں اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ صرف دو ہاتھ بھی کافی نہیں، ان میں خلوص، عزم اور سنجیدگی بھی ہونی چاہیئے، اگر کسی ہاتھ میں ڈھیلا پن اور سستی ہوگی، تو تالی نہیں بج سکتی، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ تقریب بین المذاہب کوئی مشینی عمل نہیں، زبان سے زیادہ اس کا تعلق دل سے ہے، اور خارجی مسئلہ سے زیادہ اس کا تعلق اندرونی مسئلہ سے ہے، ابھی کسی ایسے گوند کی ایجاد نہیں ہوسکی جس سے کاغذ کی طرح دل بھی جڑ جائیں، اس لئے یہ خواہش، اور جدوجہد دل سے اٹھنی چاہیئے، اور اس میں اتنی روانی اور ابال ہونا چاہیئے کہ دل اس کی قوت، اور حرارت محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے، اس کے لئے آپس میں مفاہمت کرنی ہوگی، کچھ چیزوں سے دست بردار ہونا، اور کچھ کسر و انکسار سے کام لینا پڑے گا، لیکن ایک بار جب ہمارے دل اس کو قبول کرنے پر تیار ہوجائیں گے، تو پھر محبت و اعتماد کے سیل رواں کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہر سکے گی، اس لئے کہ محبت اپنی راہ کی ہر رکاوٹ، اور بغض و عداوت کی ہر کدورت کو بہالے جاتی ہے۔

۴۔ آخر میں ایران کے اہل علم و اہل دین کی توجہ قرآن سے زیادہ اعتنا کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ایرانی بھائی قرآن کریم کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، ان کو اس سے محبت ہے، اور وہ اس سے بے تعلق نہیں، اہل ایران قدیم زمانہ سے قرآن کی زریں کتابت و نقاشی میں آگے رہے ہیں، اس کو کتب خانوں اور میوزیم میں خاص اہتمام سے رکھنے، اور اس پر فخر کرنے اور بہتر سے بہتر طریقہ پر زیور طباعت سے آراستہ کرنے میں اب بھی وہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے پیچھے نہیں ہیں، ایران کے قدیم و جدید علماء نے قرآن مجید کی بلند پایہ تفسیریں بھی لکھی ہیں، جن میں سے متعدد ہندوستان میں بھی مشہور و متداول رہی ہیں۔

لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے ساتھ ایرانیوں کا تعلق اس سے کہیں زیادہ گہرا ہونا چاہیئے اس کی ضرورت ہے کہ اس کا ذوق ہر ذوق پر غالب، اور اس کی روح جسم و جان میں ساری و جاری ہو، جس کا ایک نتیجہ کثرت تلاوت، اور حفاظ کی کثیر تعداد کی شکل میں ملک میں دیکھا جا سکے، اس کو ہر چیز پر ترجیح دی جائے، اس کو ہر مسئلہ میں رد و قبول کا معیار، اور حسن و قبح کی میزان سمجھا جائے، وہی ہمارے علم و ادب عقیدہ و عمل، اور سیرت و اخلاق کا سدرۃ المنتہیٰ ہو۔

مجھے اس میں شک نہیں، ہمارے ایرانی فضلا اور مفکرین ان پیش کردہ حقائق میں سے بعض حقیقتوں کو محسوس کرتے ہیں، اور ان کی اشاعت و ترویج، اور تقویت کی ضرورت کا کھلے اعتراف ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک عظیم الشان تجدیدی کام ہے، اور اس سے وہی باکمال شخصیتیں عہدہ برآ ہو سکتی ہیں، جو اپنے علمی وقار و احترام کو داؤں پر لگا دیں، اور اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار رہیں، لیکن اس کامیابی سے جو خوشی و مسرت حاصل ہوگی، اس سے بڑھکر کوئی مسرت نہیں ہو سکتی، اس سے تاریخ ان کو جس عزت و احترام کے مقام پر رکھے گی اس کی برابری کوئی عزت و مرتبہ نہیں کر سکتا، اسلام کی صاف شفاف پیشانی، اور اس کی حقیقت پر جو گرد و غبار اٹ گیا ہے، تاریخ کے ملبہ نے جس طرح اس کے رخ زیبا کو چھپا لیا ہے، اور انکار و تقلید کی جو دبیز تہہ جم گئی ہے، اس کو ہٹانا، اور قرن اوّل میں دین کی جو حالت تھی، وہ حالت پھر سے پیدا کرنا کوئی آسان اور معمولی کام نہیں، بلکہ بہت بڑا جہاد، اور عظیم الشان تجدیدی کام ہے، توحید خالص، اور حقیقت دین کو اپنانے کے لئے قرآن کی دعوت صرف دوسرے مذاہب اور غیر مسلم اقوام ہی کو نہیں، امت کے تمام طبقوں اور گروہوں سے بھی ہے، وہ کسی عہد کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ کے لئے یکساں ہے۔

تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ	آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا	کہ بندگی نہ کریں، مگر ہم اللہ کی، اور شریک نہ ٹھہرائیں
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ	اس کا کسی کو، اور نہ بنائے کوئی کسی کو رب
(آل عمران ۶۴)	سوا اللہ تعالٰے کے۔

ہم اپنے ایرانی بھائیوں سے پھر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ معروضات محض خلوص حسن نیت اسلامی اتحاد کی زبردست خواہش اور ذمہ داری کے احساس کی بنا پر پیش کی گئی ہیں اگر آپ کو بین السطور کوئی ایسی چیز نظر آئے جس سے آپ اتفاق نہ کرسکیں یا حقیقت و واقعیت کے خلاف افراط و تفریط دیکھیں، تو ہم معذرت خواہ ہیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے، بے عیب ذات صرف خدا کی ہے۔

ایرانی دوستوں سے ایک سوال

ایرانی بھائیوں سے رخصت ہونے سے پہلے ہم ان کے سامنے ایک ایسا سوال رکھنا چاہتے ہیں، جو بہت سے دماغوں میں ابھرتا رہا ہے، وہ سوال یہ ہے کہ آخر ایران جیسا زرخیز و مردم خیز ملک جس نے گذشتہ دور میں بھی .... ، ہر علم و فن اور زندگی کے ہر میدان میں بڑی تعداد میں ایسے جینیس اور عبقری انسانوں کو پیدا کیا، جو اپنی غیر معمولی ذہانت و صلاحیت میں عام سطح سے بلند نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ طبقات و تراجم اور سیرت و تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ایران میں بجز جینیس اور عبقری انسانوں کے اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا، اور "لنکا میں ہر ایک باون گز ہی کا ہوتا ہے" لیکن ایران کے دور آخر پر نظر رکھنے والا حیرت و تعجب سے سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس مردم خیز ملک میں

باکمال انسان پیدا ہونے کیوں بند ہو گئے، اسلامی علوم وفنون میں مہارت، ذہانت وذکاوت علمی تحقیق، حتیٰ کہ ادب وشاعری یکسر انحطاط وزوال کا شکار کیوں ہیں، صدیاں بیت گئیں، نسلوں پر نسلیں گذر گئیں، اور کسی ایسے عالم، ادیب وشاعر، مصنف ومحقق، ریاضی داں، فلسفی یا ایسے قائد ورہنما کا نام تک نہیں سننے میں آتا جو اپنے کارناموں سے دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے، اور زمانہ کی آنکھوں کو خیرہ کردے، دسویں صدی ہجری کے بعد یہ خلا اس شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال جیسا ایرانی ادبیات کا گرویدہ، اور ایران کی تاریخ کا سچا طالب علم بھی شکایت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگلِ ایران، وہی تبریز ہے ساقی

ہم نے ایرانی علماء، اور دانشوروں کے سامنے بھی یہ سوال پیش کیا، اور ان سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال بھی کیا، مگر کوئی تشفی بخش جواب ہمیں نہ مل سکا، یہ سوال ہمارے ذہنوں میں برابر گونج رہا ہے کہ ایران کے جمود وانحطاط کا کیا یہ سبب تھا کہ خیالات کی بلندی حوصلہ مندی، مادیت کے خلاف بغاوت، حقیقت کی جستجو، ساز دل کو چھیڑنے اور روح کے سرچشموں کو جاری کرنے میں جس تصوف نے مرکزی اور بنیادی کردار ادا کیا تھا اس کا خاتمہ ہی انحطاط کا حقیقی سبب ہے، یا اس زوال وانحطاط کی وجہ وسائل کی فراوانی، زندگی کی آسانی، اور عمومی فارغ البالی ہے جس سے ایران کو مدت دراز سے متمتع ہونے کا موقعہ مل رہا ہے، اور جس کی وجہ سے طبیعتوں میں سہولت پسندی، اور عزائم میں افسردگی اور پستی پیدا ہو گئی ہے، یا اس انحطاط وجمود کی علت یہ ہے کہ علم ومسلک کے بارے میں ایران میں عرصہ سے ایک مخصوص ومحدود شکل پر انحصار کرلیا گیا ہے، اور اس کے علاوہ دوسرے مسلک

اور ہر نظام کو ملک سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی، اس طرح ایران صفویوں کے دور کے بعد سے ایک خول میں زندگی گذار رہا ہے، اور اس کو باہر کی علمی دنیا کے جھونکے جو اس کے علمی و فکری قوی میں حرکت پیدا کریں، اور اس کے علمی وادبی ذخیرے میں اضافہ کریں، نہیں پہونچنے پاتے، یا اس سے زیادہ کوئی اور عمیق و وسیع سبب ہے جس کی طرف ہماری نظر نہیں پہونچ سکی۔

فلسفہ تاریخ اور قوموں کے عروج وانقلاب سے اس سوال کا گہرا تعلق ہے حقیقت تک رسائی اور علمی تحقیق کے لئے اس سوال کا تشفی بخش جواب ضروری ہے ہم یہ جواب اسی ایران سے حاصل کرنا چاہتے ہیں جس نے اپنی علمی وادبی صلاحیت، و ذہانت سے ایک عرصہ تک پوری دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا تھا، اس کو اس اہم اور نازک سوال کی طرف توجہ کرنی چاہئے، اور اپنی گذشتہ شاندار تاریخ کو اسے پھر دہرانا چاہئے، یہ بات ایران، عالم اسلام بلکہ انسانی دنیا کے مفاد میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی جس نے خفتہ ایران کو بیدار کر دیا

(یہ اس عربی تقریر کا ترجمہ ہے جو ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ ۱۵ر جون ۱۹۷۳ء کو اس جلسۂ استقبالیہ میں کی گئی تھی جو آیت اللہ العظمیٰ مرزا محمد خلیل کمرائی کے دولت کدہ واقع زرین نعل تہران میں منعقد کیا گیا تھا ترجمہ مولوی اجمل اصلاحی ندوی کے قلم سے ہے)

حضرات! ابھی آپ کے سامنے قاری نے سورۂ آل عمران کی مشہور آیت کی تلاوت کی:—

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ

اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم اللہ تعالیٰ کے انعام سے آپس

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (آل عمران - ۱۰۳)

بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس سے خدا تعالےٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالےٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کرکے بتاتے رہتے ہیں، تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔

ہمارے فاضل دوست استاد احمد محمد جمال نے اس آیت کے پہلے حصے پر بحث کی ہے میں اس کے دوسرے حصہ یعنی :-

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (آل عمران - ۱۰۳)

اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس سے خدا تعالےٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالےٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کرکے بتاتے رہتے ہیں، تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔

پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں، نیز اس پر غور و فکر کی دعوت دوں گا۔

حضرات! یہ آیت کریمہ ہر وقت ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہمارے دلوں پر نقش رہنی چاہیے، اس آیت میں اس عظیم نعمت کا ذکر ہے جس سے اللہ تعالےٰ نے امت اسلامیہ کو سرفراز فرمایا ہے، اور اے باشندگان ایران آپ ہی تنہا اس نعمت کے مالک نہیں ہیں، بلکہ ہم برصغیر کے رہنے والے، بلکہ اس روئے زمین پر بسنے والے تمام مسلمان، بلکہ اس جزیرۃ العرب کے باشندے بھی جہاں سے اسلام کی کرنیں پھوٹیں، اور ساری کائنات پر چھا گئیں، اس عظیم نعمت میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔

ہم سب جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، نہ توحید و نبوت سے واقف تھے، نہ حشر و نشر کی خبر تھی، اخلاقی قدروں سے یکسر ناآشنا، اور صحیح مذہبی تعلیمات سے قطعاً بے بہرہ تھے، اوہام و خرافات میں گرفتار تھے، ظالم و جابر حکومتوں کے جور و استبداد کا شکار تھے، انسانیت ہر طرف پامال ہو رہی تھی۔

ایک طرف مطلق العنان حکمراں، دوسری طرف علم و مذہب کے اجارہ دار علماء معبود بنے بیٹھے تھے، عوام ان کی پرستش، اور اندھی اطاعت پر مجبور تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (التوبہ۔ ۳۱)	کو (باعتبار طاعت کے) رب بنا رکھا ہے۔

اسلام آیا، اور اس کی ضیا پاشیوں نے روئے زمین کے گوشہ گوشہ کو منور کیا، اسلام کی نعمت ساری انسانیت کے لیے عام تھی، وہ اس بارش کی طرح تھی، جو سپید و سیاہ اور بندہ و آقا کے درمیان امتیاز نہیں کرتی، وہ تو بادل تھا، جو پست و بلند، گلشن و صحرا، سب کو سیراب کر گیا، اور حق تو یہ تھا کہ اسے عربی شاعر کے اس قول سے مخاطب کیا جائے ؎

فاذهب كما ذهبت غوادي مزنة
أثنى عليها السهل والأوعار

ایک فارسی شاعر کا قول ہے، جو زیادہ بلیغ ہے ؎

پرتو مہر بویرانہ و آباد یکیست
حسن چوں تیغ کشد بندہ و آزاد یکیست

اس نعمت سے عظیم تر کوئی نعمت نہیں، یہاں تک کہ زندگی بھی اپنی ہر لذت و سرور کا

سرچشمہ ہے، اگر اسلام توحید خالص، اور ایمان کی نعمت نہ ہوتی تو یہ زندگی ایک عذاب مسلسل ہوتی، اور اس کی حیثیت جہنم تک پہونچنے کے لئے ایک پل سے زیادہ نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے ہمیں نوازا، اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے، اور اس نعمت کے حصول میں ہم پر نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی، اور آپ کی بعثت ورسالت، اور دعوت وجہاد کا ناقابل فراموش احسان ہے۔

اقبال کا یہ کہنا کسی طرح بے جا نہیں ہے کہ اگر نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم (علیہ الف الف تحیۃ) نہ ہوتے، اگر آپ کے اصحاب اور اہل بیت نہ ہوتے، اگر دعوت اسلامی کے وہ اولین داعی اور اس کی راہ میں جان کی بازی لگا دینے والے مجاہدین نہ ہوتے، تو نہ اسلامی ایران ہوتا، نہ اسلامی ہند نہ اسلامی مصر، نہ اسلامی شام، کسی بھی اسلامی ملک کا وجود نہ ہوتا، یہاں تک کہ وہ جزیرۃ العرب بھی جو ہماری محبت وعقیدت کا مرکز ہے اور جس کی طرف ہم رخ کرتے ہیں موجود نہ ہوتا ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہوتا خصوصاً جبکہ ہم مشرق اقصیٰ کے باشندے ہیں اور آپ ایران کے حضور ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تمام ملکوں اور قوموں کو ایک شیرازہ میں منسلک کیا، مختلف دلوں اور دماغوں کو ملنے کا موقع نصیب ہوا، افکار وخیالات کا اختلاط ہوا، نت نئے علوم ومعارف نے جنم لیا، علم کا ایک چشمہ ہندوستان میں بہہ رہا تھا، تو دوسرا ایران میں، دونوں میں ایک طویل فاصلہ تھا، اسی طرح اور بھی نہ جانے کتنے چشمے ہزاروں سال پہلے اپنی تنگ راہوں میں رواں تھے، اسلام آیا تو اس نے ان بکھرے ہوئے بے شمار سوتوں کو ایک عظیم چشمۂ صافی میں بدل دیا، اسے ایک بلند اور مشترک مقصد کی خاطر استعمال کیا، اور انسانیت کے لئے مفید اور نتیجہ خیز بنایا، اس طرح ہندوستانی وایرانی اور عربی وعجمی افکار کا ایسا نفع بخش، اور خیر وبرکت سے معمور امتزاج وجود میں آیا جس کی نظیر

تمدن وثقافت کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، ایرانیوں کے ذوق جمال، وسعت خیال، لطافت احساس، اور عرب کی سلامتی طبع، بلند حوصلگی، حقیقت پسندی، اور اسلامی عقائد واعمال کا ایسا سنگم چشم فلک نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔

ایران اپنے خواب گراں سے بیدار ہوا، اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ملا، اس کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑکنے لگیں، تو ایسا معلوم ہوا گویا یہ سرزمین جینئیس اور یکتائے روزگار شخصیتوں ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے، گویا علم وادب اس کے خمیر میں داخل ہے، ذوق جمال اس کی آب وہوا میں بسا ہوا ہے، گویا اس میں عالم، ادیب، شاعر، فن کار، یا صوفی، مربی، مدرس اور مصنف کے سوا کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا، اگر کوئی فقہ وحدیث، شعروادب، اور تصنیف وتالیف کے میدان میں چوٹی کی شخصیات کو بھی شمار کرنا چاہے، تو شمار نہیں کرسکتا، تذکرہ وتاریخ کی کتابیں ان کے حالات اور کارناموں سے بھری پڑی ہیں، خدا معلوم کتنے ممالک نے ہندوستان کی طرح ایران کے اس علمی وادبی خوان یغما سے خوشہ چینی کی ہے، ہم سب ان کے علم وفضل کے بحر بیکراں سے اپنی تشنگی بجھاتے ہیں، ان کے شعروادب سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہیں، اور ان کی تقلید واتباع پر فخر کرتے ہیں۔

لیکن یہ تمام عبقری اور یکتائے روزگار شخصیات جن کے زبردست علمی کمالات وادبی معجز طرازیوں نے ساری دنیا کو محو حیرت کردیا، اسلام ہی کے نونہال، اور دعوت اسلام ہی کے پیداوار تھے، ان سب کو اس نئے دین نے جنم دیا تھا، جس کو لے کر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اسلام اور اخوت اسلامی کے سایہ میں

آپ سے اس مبارک ملاقات کا شرف حاصل ہوا، آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مشرق و مغرب کے سارے مسلمان اسی عالمگیر اسلامی اخوت کے لئے بے قرار ہیں، لیکن یاد رکھئے دنیا و آخرت کی ہر سعادت کا سرچشمہ اسلام اور محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات گرامی ہے، جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں گمراہی کے بعد ہدایت، ذلت کے بعد عزت، اور تنگ دستی کے بعد وسعت سے نوازا، اور جہل کے بعد علم، اور اختلاف و انتشار کے بعد اتحاد کی دولت سے مالا مال کیا۔

اسلامی تہذیب کے سوا کوئی ہماری تہذیب نہیں، اسلامی تاریخ کے سوا کوئی ہماری تاریخ نہیں، اسلام کے عطا کردہ عزت و سربلندی کے علاوہ ہمارے لئے کوئی عزت و سربلندی نہیں، ہم تمام محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے طفیل جی رہے ہیں۔

آپ کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی، بنی آدم میں سے جس کو بھی سعادت و خیر کا کوئی ذرہ ملا، وہ خواہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب ہی کے مرتبہ کا کوئی شخص کیوں نہ ہو، سیدنا محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے واسطے ہی سے نصیب ہوا۔

اگر آپ نہ ہوتے تو کسی کو نہ دین میں کوئی فضیلت حاصل ہوتی نہ ایمان و یقین کا کوئی حصہ کسی کو نصیب ہوتا، اور نہ کسی کے یہ حیرت انگیز کارنامے سامنے آتے، جو تاریخ کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں، اور جن پر مسلمانوں کو بجا طور پر ناز ہے۔

اور آج بھی کسی شخص کو اگر اس سعادت کا کوئی حصہ ملا ہے تو وہ بھی اسی ذات گرامی کے طفیل۔

حضرات! ہر طرف ناکہ بندی ہے، ساری راہیں مسدود اور سارے دریچے بند ہیں، صرف اسلام کا راستہ ہے، اور صرف ایک دریچہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ کھول رکھا ہے، ارشاد ہے:-

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران ۔۱۹) بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ ہم عرب و عجم سب سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں، اور اپنا علمی، عقلی، فکری، تہذیبی، اور اعتقادی سلسلہ آپؐ ہی سے جوڑتے ہیں، ہر شخص نے آپؐ ہی کی شمع ہدایت سے کسب نور کیا ہے، اور ہر شخص آپؐ ہی کی دانش گاہ کا فیض یافتہ ہے، شاعر نے خوب کہا ہے ؎

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آن
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

امت اسلامیہ کے اندر جب تک اس حقیقت کا عرفان رہے گا، اور جب تک اس اصول کو وہ مضبوطی سے تھامے رہے گی، بے راہ نہیں ہو سکتی، اور نہ مصائب و مشکلات کا شکار ہو سکتی ہے۔

اخیر میں آپ کے پرخلوص اعزاز، اور آپ کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے لئے ایمان کی تکمیل، اور اس کی حفاظت فرمائے، خاتمہ بالخیر ہو اور قیامت کے روز ہمارا نام ان خوش قسمت لوگوں کی فہرست میں ہو جن کے چہرے دمکتے ہوں گے

مسئلہ صرف دین و لادینیت کا ہے

(قم میں رابطہ کے وفد کی پذیرائی ایران کے مشہور عالم علامہ شریعتمداری نے اپنے دولت کدہ پر کی، موصوف کے اشارہ و ایما سے ایک عالم شیخ سعید النعمانی نے ایک خیر مقدمی تقریر کی جس میں انھوں نے خیر مقدمی تمہید کے بعد اتحاد و اتفاق پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم نے اب بھی اختلاف و انتشار کے سیاہ صفحات کو ہمیشہ کے لئے نہ لپیٹ دیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرے گی، ہمیں اب اپنے سفر کا آغاز اسی طرح کرنا چاہیے جیسا کہ ہمارے سلف صالحین نے کیا تھا، اس راہ میں ہمیں غیر معمولی عزم و استقامت اور ایثار و قربانی سے کام لینا ہوگا، اس لئے کہ ہمارا سامنا ایسے دشمن سے ہے، جو مسلک و مذہب اور شیعہ سنی میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔

شیخ سعید کی تقریر کے بعد راقم الحروف نے جو کچھ عرض کیا یہ اس تقریر کا خلاصہ ہے

ترجمہ مولوی نذر الحفیظ ندوی کے قلم سے ہے)

حضرات! ابھی ایک فاضل مقرر نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ مشہور اور تسلیم شدہ حقائق ہیں، اور اس میں کسی بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انتشار و افتراق سے بچنے اور اختلافات کو ختم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اصل سرچشمہ اور مرکز کی طرف رجوع کیا جائے، اس لئے کہ جب بھیڑوں کا ریوڑ انتشار و پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے تو ان کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مرکز کی طرف رجوع کیا جائے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ "بھیڑیا اس بکری کو اپنا لقمہ بناتا ہے، جو اپنے ریوڑ سے علیحدہ ہو" اس لئے جنگل میں منتشر بھیڑوں کو بھیڑیوں کا لقمہ بننے سے بچانے کے لئے ان کے راعی و محافظ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اور اس کی سرکردگی و نگرانی میں اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا کرنا ہوگا۔

حضرات! ہم ایک امت سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے نبی ایک ہیں، اور ہماری کتاب اور ہمارا قبلہ بھی ایک ہی ہے، رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جب اپنے معاصرین اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط تحریر فرماتے تھے تو قرآن مجید کی یہ آسمانی تبلیغ اور حکیمانہ آیت تحریر فرماتے تھے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران ـ ۶۴)	کہہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، یہ کہ بجز اللہ تعالےٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے، اللہ تعالےٰ کو چھوڑ کر پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے

اللہ تعالیٰ نے تفرقہ وانتشار، اختلاف وکمزوری اور ذلت ونکبت سے بچنے کے لئے اتحاد واتفاق، طاقت وقوت اور عزت وسربلندی کا راستہ بتلایا ہے، اور اس کو انبیاء ورسول اور ان کے نائبین علماء کی ذمہ داری قرار دی ہے، اور اس آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ، وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا، أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ۔

(آل عمران ۷۹۔۸۰)

کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالےٰ اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمادیں، پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ۔ خدا تعالےٰ کو چھوڑ کر، لیکن کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ، بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو، اور نہ یہ بات بتلائے گا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب قرار دے لو کیا وہ تم کو کفر کی بات بتلائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

میں اس بات سے مکمل اتفاق رائے کرتا ہوں کہ "دشمن کسی دین ومذہب، گروہ اور جماعت اور قومیت کے درمیان امتیاز نہیں کرتا" اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ آج مذہب کا مقابلہ مذہب سے نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ اس وقت دین ولادینیت کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ درپیش ہے، اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ یا تو انسان خدا ورسول، آخرت غیبی حقائق اور رسول کے لائے ہوئے پیغام پر یقین رکھے اور نجات کو اسی دین پر منحصر سمجھے جو اللہ تعالےٰ کے نزدیک معتبر ہے، یا پھر ان تمام غیبی حقائق کا یکسر انکار کردے

اور تمام مذاہب سے اعراض کرے۔

حضرات! اس وقت صرف دین ولادینیت کا مسئلہ ہے، اگر آپ چاہیں تو اس کو کمیونزم کا نام دے سکتے ہیں، ورنہ لادینیت تو کمیونزم سے زیادہ وسیع مفہوم پر حاوی ہے اس لئے کہ وہ تمام ادیان ومذاہب، غیبی حقائق، انبیاء کی تعلیمات اور تمام دینی واخلاقی قدروں کی منکر و مخالف بلکہ ان کے خلاف صف آرا ہے، دوسری طرف انبیاء اور ان کے نائبین کا کیمپ ہے جس کے ہم ادنیٰ خادم اور رضاکار ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم اور بے پایاں احسان سے ہمیں اس خدمت کے لئے نامور فرمایا ہے، اس میں ہماری کسی صلاحیت اور استحقاق کو دخل نہیں ہے، ہمارا فرض ہے کہ جو پرچم محمدی ہمارے ہاتھ میں ہے ہم اس کو ہمیشہ سربلند رکھیں، اور اس کے تلے جمع ہو کر اتحاد واتفاق سے اس دین کو تمام دنیا میں پھیلانے اور اس کو سربلند رکھنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں، کوششوں اور جدوجہد کو بروئے کار لائیں۔

مشرق و مغرب کے سنگم

لبنان میں

مترجم

مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی

اسلام کے داعیانِ اولین کے نقشِ قدم پر

افغانستان وایران کے دورہ سے واپسی کے بعد پانچ ہفتے ہم نے بیت المقدس اور مسجدِ نبوی کے سائے میں گزارے، ان ایام نے ہم کو اس ناقابلِ انکار حقیقت پر ایک نیا یقین و اعتماد بخشا کہ اسلام ہی قوموں کو متحد کرنے، دلوں کو جوڑنے، مسائل کو سلجھانے اور قافلۂ حیات کی قیادت کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ نئے سفر کا نیا توشہ تھا، جس سفر کا آغاز گہوارۂ اسلام اور دعوتِ اسلامی کے مرکز سے ہونے والا تھا، اور جس کی منزل وہ ممالک تھے جو اولین مرحلے میں اسلام کی روشنی سے فیضیاب ہوئے، خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی دعوت کو اپنایا، اور ساتویں صدی ہجری تک خلافتِ اسلامی کا مرکز بن کر اس کو سینے سے لگائے رہے، انھیں ممالک سے اسلام کے سیلاب نے شمال مغرب میں کوہ اطلس اور اندلس، اور جنوب مشرق میں کوہ ہندوکش اور دریائے سندھ کی وادی کا رخ کیا، اور انھیں میں اسلامی علوم کا نشوونما اور ارتقا ہوا، میری مراد ملک شام (جس میں موجودہ سوریا، فلسطین، لبنان، شرق اردن شامل ہیں) اور عراق سے ہے، یہ ایک قدرتی لائن تھی جس کو اسلام کے مبلغین نے جزیرۃ العرب سے نکل کر اختیار کیا تھا

ہم بھی انھیں کے نقش قدم کی پیروی کر رہے تھے، اور انھیں کے راستہ پر گامزن تھے، بلاشبہ اگر وہ مبلغین نہ ہوتے، ان کا جہاد نہ ہوتا، ان کا ایمان واخلاص نہ ہوتا، ان کی سچائی اور دیانت داری نہ ہوتی، ان کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی نہ ہوتی تو اس علاقہ میں یہ دین نہ پھیلتا جس کے نام پر ہم ملتے ہیں۔ نہ یہ اسلامی اخوت ہوتی جس کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں، نہ یہ قرآنی عربی زبان ہوتی جو عرب اور عجم کے لئے افہام وتفہیم اور تبادلۂ خیال کا وسیلہ ہے، اور جس کو وہ اپنی نسلی زبانوں پر توقیت دیتے ہیں، نہ ان ملکوں کا علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور فکر انسانی کی تاریخ میں کوئی ایسا نمایاں اور تعمیری کردار ہوتا جس کے بغیر انسانیت کی تاریخ نامکمل رہ جائے، نہ دمشق وبغداد ہوتے، نہ ولید وہارون، نہ ابوتمام اور بحتری ہوتے نہ متنبی اور معری، نہ سیبویہ اور کسائی ہوتے نہ کوفہ اور بصرہ نہ رصافہ اور کرخ نہ ابوحنیفہ ہوتے نہ اوزاعی[1]، نہ ابویزید بسطامی[2] نہ عبدالقادر جیلانی[3]، نہ مستنصریہ اور نہ نوریہ[4] اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو جزائے خیر دے، اسلام، عراق وشام، دین وعقیدہ، انسانیت وتمدن اور علوم وفنون سب کی جانب سے۔

نئے وفد کی تشکیل

رابطہ کا وہ وفد جس نے افغانستان وایران کا دورہ کیا تھا، اور اسی کو لبنان، شرق اردن، سوریا اور عراق کا دورہ کرنا تھا، دونوں سابق رفقاء، راقم سطور اور استاذ احمد محمد جمال پر مشتمل تھا، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اس وفد کے سکریٹری تھے، لیکن بعض

---

[1] امام ابوحنیفہ بغداد میں اور امام اوزاعی بیروت میں مدفون ہیں۔ [2] دمشق میں مدفون ہیں [3] بغداد میں زندگی گزاری اور وہیں کی خاک میں آسودہ ہیں۔ [4] دو عظیم مدرسے جن میں پہلا بغداد میں تھا دوسرا دمشق میں۔

شدید مجبوریوں کی بنا پر مکہ میں ان کا قیام ضروری ہوگیا، تو رابطہ کے جنرل سکریٹری نے رابطہ میں اسلامی تنظیموں کے سکریٹری استاذ عبداللہ باہبری کو وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے منتخب کیا، استاذ باہبری ایک ادیب تعلیمافتہ اور خوش مزاج نوجوان ہیں، حال ہی میں شمالی افریقہ کے دورہ سے واپس آئے تھے، جو سابق مفتی مصر شیخ حسنین محمد مخلوف شیخ محمد محمود الصواف اور شیخ عبداللہ انصاری کی رفاقت میں ہوا تھا، مگر اس کے باوجود انھوں نے مشغولیت کو راحت پر ترجیح دی، نئے وفد کی رفاقت منظور کرلی اور وفد کی تمام ذمہ داریوں کو پوری دلچسپی، سرگرمی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

اپنی کمزوری صحت اور گوناگوں عوارض کے پیش نظر مجھے اس طویل سفر میں ایک ایسے رفیق کی ضرورت تھی، جو میرے مزاج و ضروریات سے واقف ہو اس بنا پر رابطہ نے ایک نئے رفیق اور میرے ذاتی معاون کا اضافہ کر دیا، وہ تھے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادب عربی کے استاد، پندرہ روزہ "الرائد" کے ایڈیٹر خواہرزادہ عزیز مولوی محمد رابع حسنی ندوی جن کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو مکہ میں قیام کرنا پڑا، سفر کی مشکلات کی وجہ سے جن کا سامنا اس دور میں ہر شخص کو کرنا پڑتا ہے، ان کو ہندستان سے سعودی عرب پہنچنے میں خاصی تاخیر ہوئی (اگرچہ جدید تہذیب کے شیدائیوں کا کہنا ہے کہ اس دور میں سفر بہت آسان ہوگیا ہے) اس بنا پر سفر موخر ہوتا گیا، آخر کار جمادی الثانیہ کے اواخر میں ممکن ہو سکا

بیروت میں

اتوار کے روز جمادی الثانیہ کی آخری تاریخ تھی (۲۹ جولائی ۱۹۷۳ء) عصر کے وقت

ہندوستانی وقت کے مطابق ہم سعودی طیارہ پر سوار ہوئے، ہم کو رخصت کرنے کے لئے رابطہ کے معاون جنرل سکریٹری استاذ سید محمد صفوت سقا امینی، جدہ میں رابطہ کے دفتر کے انچارج استاذ خلیل عثانی، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، جدہ میں نوروالی گھرانے کے افراد اور دوسرے دوست واحباب تشریف لائے تھے، غروب آفتاب سے دو گھنٹے قبل ہم بیروت پہنچ گئے۔

ہوائی اڈہ پر دارالافتاء لبنان کے ناظم عمومی سید حسین قوتلی اور جمہوریہ لبنان کے مفتی شیخ حسن خالد کے قائم مقام شیخ محمد علی جوزو مفتی جبل لبنان نے ہمارا استقبال کیا، ان کے ساتھ سعودی سفارتخانہ کے (قائم مقام سفیر) چارج ڈی افیرس عبدالحسن سمان، لبنانی وزارت خارجہ کے ایک نمائندہ اور لبنان سے رابطہ عالم اسلامی کے رکن شیخ سعدی یاسین بھی تھے، ہوائی اڈہ پر بیروت میں رابطہ کے نمائندہ استاذ عبدالحکیم عابدین[1] سے بھی ملاقات ہوئی۔

ہوائی اڈہ پر معلوم ہوا کہ شیخ حسن خالد مفتی لبنان نے پہلے سے جبل بحمدون پر ایک شاندار ہوٹل اور بیروت کے ایک ہوٹل کے چند کمرے ریزرو کرا لئے ہیں اور ہم کو اختیار ہے جبل میں قیام کریں یا بیروت میں، موسم کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے جبل کو ترجیح دی، اسی سے ہم کو پتہ چلا کہ ہم مفتی لبنان کے مہمان ہیں، ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بحمدون روانہ ہوگئے جہاں شیپرڈ ہوٹل (SHEPERD) میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔

---

[1] استاذ عبدالحکیم عابدین اخوان المسلمین اور دعوت اسلامی کے حلقہ کی معروف شخصیت ہیں، ایک طویل عرصہ تک مصر میں اخوان کے ناظم رہے ہیں، امام حسن البنا شہیدؒ کے بہنوئی ہیں بیک وقت ایک ادیب، شاعر، مقرر اور وکیل ہیں۔

اسلامی اداروں اور بیروت کے مختلف علاقوں کا دورہ

دوسرے روز دوشنبہ یکم رجب ۱۳۹۳ھ (۳۰ جولائی ۱۹۷۳ء) کو ہم نے مفتی لبنان شیخ حسن خالد سے ان کے دفتر میں افتاء کے ناظم عمومی سید حسین قوتلی کی موجودگی میں ملاقات کی لبنان میں مسلمانوں کے حالات، اسلامی اداروں کے ساتھ مادی اور اخلاقی تعاون کی ضرورت اور ان خطرات کے موضوع پر جن میں لبنانی مسلمان گھرے ہوئے ہیں، مفتی صاحب نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک وفد کے ساتھ بہت صفائی سے گفتگو کی پھر مفتی صاحب ہی کی معیت میں وفد ایک معلوماتی دورہ پر روانہ ہوا جس کی پہلی منزل بیروت کی وہ دینی تعلیم گاہ تھی جس کا نام ازہر لبنان ہے۔ وفد نے ادارہ کے کتب خانہ اور اس کے مختلف شعبوں کا معاینہ کیا، موسم گرما کی تعطیل ہو چکی تھی، کتب خانہ کے ہال میں کچھ ریسرچ اسکالر اپنی تحقیق اور ریسرچ میں مصروف تھے، وفد کے ساتھ ازہر لبنان کے ناظم شیخ خلیل کلی تھے، پھر وفد نے بیروت کے اسلامی یتیم خانہ کا رخ کیا جہاں یتیم خانہ کے ناظم استاذ محمد برکات نے وفد کا استقبال کیا، وفد کو یتیم خانہ دکھایا اور اس کے مقاصد اور سرگرمیوں کی وضاحت کی، ہر چیز نظافت اور خوش سلیقگی کا پتہ دے رہی تھی، اور یتیم بچوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کو اپنی ذلت و کمتری کے احساس سے بچانے کے لئے نفسیاتی طریقے اختیار کئے گئے تھے۔

شہر کے مختلف حصوں سے ہمارا گزر ہوا، بہت سے علاقوں کی دینی، اقتصادی اور اجتماعی سطح اور معیار ایک دوسرے سے بہت مختلف نظر آتا تھا، ساحل سمندر کی سیر کرتے ہوئے جب ہم اس محلہ کی طرف جا رہے تھے، جو امام اوزاعی کے مدفن ہونے کی وجہ سے انہیں کے نام سے موسوم ہے، ہم فدائین کے مرکز سے گزرے جہاں لبنانی فوج اور فدائین کے

درمیان معرکہ کارزار گرم ہوا تھا، اور ہم نے دیکھا کس طرح مختلف مذہبی جذبات اور سیاسی اغراض نے اس معرکہ میں حصہ لیا تھا، اور ملک کی زندگی اور مختلف عناصر کے باہمی تعلقات پر کس طرح یہ جنگ اثر انداز ہوئی تھی، عمارتوں اور ملک کے باشندوں کے دلوں میں گولیوں اور بموں کے اثرات کا مشاہدہ کیا، نیز پناہ گزینوں اور فلسطین کا مسئلہ جس پیچیدگی، ابہام اور تضاد کا شکار ہے جس کی نظیر موجودہ دنیا کے دوسرے مسائل میں ملنی مشکل ہے، اس کو سمجھنے میں مدد ملی۔

اس علاقہ سے بھی ہمارا گزر ہوا جہاں فلسطینی پناہ گزیں رہتے ہیں، اس علاقہ میں افلاس، پسماندگی، گندگی، اپنے مستقبل کی طرف سے مایوسی، بے اعتمادی اور موجودہ حالات سے برگشتگی عام ہے، یہ تمام چیزیں اسی ملک کے لئے نہیں بلکہ پوری عرب دنیا کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ صورت حال ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتی خواہ اس کے دور کرنے میں کتنا ہی وقت لگے اور اس پر پردہ ڈالنے کی کیسی ہی کوشش کی جائے۔

دوسری طرف پورا ملک زندگی کی نعمتوں اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور ہر جگہ دولت کی ریل پیل ہے۔

بیروت پر ایک نظر

لبنان کے مشہور شہروں اور اسلامی مرکزوں، طرابلس اور صیدا کا رخ کرنے سے پہلے جو ہمارے دورہ کے پروگرام میں شامل ہے، ہم بیروت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں، بیروت جو مشرق عربی کے لوگوں کا محبوب شہر اور تفریح گاہ ہے، جہاں وہ موسم گرما گزارتے ہیں، اور جہاں ان کی دولت کا دریا امنڈتا نظر آتا ہے، عظیم عربی شاعر ابوتمام طائی کا

یہ قول بیروت پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

دنیا معاش للفتی حتی اذا

حل الربیع فانما ھی منظر

ترجمہ:۔ دنیا آدمی کے لئے کھانے کمانے کی جگہ ہے، مگر جب بہار آتی ہے تو تفریح گاہ، ہی تفریح گاہ ہے۔

بیروت ایک عظیم تجارتی مرکز ہے، مگر موسم گرما میں وہ صرف دل بہلانے کی جگہ اور نزہت گاہ ہے اگر کوئی شخص اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے کہ مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں نے کس طرح عربوں کی فطرت مسخ کردی ہے، اور عرب کس حد تک عیش پسند اور ساری حدود قیود۔ خواہ مذہب و شریعت کے عائد کردہ ہوں، یا روایات اور عام انسانی اقدار کی۔ سے آزاد ہو چکے ہیں، اور عرب دارالحکومتوں میں خرید و فروخت اور افراط زر کی سطح کیا ہے تو اس کو بیروت جانا چاہیئے، اور لبنان میں موسم گرما گزارنے کے مقامات پر کچھ ایام گزارنے چاہئیں، اتفاق سے ہمارا دورہ گرمی کے سخت دنوں میں تھا جب بیروت کی رعنائی اور دلکشی عروج پر تھی، اس سے پہلے بھی گرمی اور سردی دونوں موسموں میں متعدد بار بیروت آنے کا موقع ملا تھا، مگر خاص مقصد کے تحت آنا ہوتا تھا جس کی وجہ سے نشر و اشاعت کے مرکزوں، کتاب گھروں اور بعض اسلامی اداروں سے زیادہ کچھ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن اس آخری دورے میں اس شہر کے حالات و خصوصیات کے تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا۔

مشہور لبنانی ادیب امین الریحانی[1] نے اپنے ایک مضمون میں بیروت کا بہترین نقشہ

---

[1] امین الریحانی ایک مشہور صاحب طرز لبنانی ادیب تھے جن کی کتابیں اور مقالات اس (باقی ص ۱۳۶ پر)

کھینچا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بیروت تمدن کی ایک نعمت بھی ہے، اور تمدن کی ایک لعنت بھی، بیروت ایک مشرقی موتی ہے، جو تانبے کے مغربی طشت میں رکھا ہوا ہے، صبح کے وقت ملکۂ مشرق کے پاؤں کا پازیب اور غروب کے وقت ملکۂ مغرب کی کلائی کا کنگن، بیروت کیچڑ میں پڑا ہوا ایک درنایاب ہے، جس پر بجلی کی کرنیں شرماتی ہوئی پڑتی ہیں، بیروت ایک مرجان ہے، جو ایک ایسے ساحل پر ہے، جس کا سونا ریت میں اور جس کی چاندی کیچڑ میں مل گئی ہے۔

بیروت پیرس کی ایک کنیز ہے، بیروت ایک ماہتاب ہے جس پر مغرب کی روشنی منعکس ہوتی ہے تو مشرق کو منور کرتا ہے، اور مغرب کی تاریکی بھی منعکس ہوتی ہے، جو مشرق کی تاریکی میں اضافہ کردیتی ہے، بیروت علوم کا سرچشمہ اور خرافات کا گودام ہے۔"[۱]

یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ مضمون آج سے ۶۲ سال پہلے لکھا گیا تھا جب پورا شام عثمانیہ سلطنت میں شامل تھا، اور یہ معلوم ہے کہ لبنان اور اس کے دارالحکومت بیروت پر چوتھائی صدی تک فرانس حکمراں رہا ہے، فرانس یورپ کے ملکوں میں سب سے متمدن اور ترقی یافتہ ملک، اور فرانسیسی معاشرہ یورپ کا سب سے زیادہ نازک مزاج، تنعم کیش اور ہر چیز میں آزادی کا دلدادہ رہا ہے، پھر جب آزادی کا دور آیا تو خرابیوں میں اور اضافہ ہوگیا،

(باقی ص۱۳۵ کا) صدی کی پہلی چوتھائی میں بڑے مقبول تھے، اکثر ملوک عرب اور زعماء و قائدین سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے سنہ ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔

[۱] مجلۃ المراقب ج ۲ شمارہ ۲، مئی سنہ ۱۹۱۲ء مطابق جمادی الاولی سنہ ۱۳۳۰ھ

ان تمام اسباب کی بنا پر بیروت کو مغربی تہذیب کی تقلید اور ہم کابی میں سب سے نمایاں درجہ حاصل ہے۔

اپنے سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفادات کے ماتحت امریکا نے اس شہر میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کی پوری کوشش کی اس لئے کہ بیروت مشرق کا دروازہ، عالم عربی کا قدرتی منفذ اور وہ تنہا عربی شہر ہے، جس پر عیسائی چھاپ گہری ہے، چنانچہ امریکا نے بیروت میں بڑے بڑے ادارے قائم کئے زبردست منصوبے تیار کئے اور ان کو تکمیل کا جامہ پہنایا، بیروت کی امریکن یونیورسٹی (الجامعة الامریکیة) آج بھی مشرق عربی کی عظیم ترین یونیورسٹی تصور کی جاتی ہے جس نے عربی فکر و ادب پر گہرا اثر ڈالا ہے، اور عرب کے علمی حلقوں میں اس کے اساتذہ اور فضلاء کو خاص رسوخ حاصل ہے۔

بیروت مشرق عربی کا سب سے بڑا سیاحتی شہر ہے، سیاحت اس کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ ہے جس پر اس کی معاشیات کا بڑی حد تک دار و مدار ہے، سیاحتی شہروں کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، ان شہروں میں تفریح اور لذت اندوزی کے لئے ہر طرح کی چھوٹ دے دی جاتی ہے، اور ان چیزوں میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا جو اکثر معاشروں میں انسانیت اور شرافت کے منافی شمار ہوتی ہیں، چنانچہ جس وقت عرب راجدھانیاں باد سموم کے تند جھونکوں کی لپیٹ میں ہوتی ہیں، بیروت رعنائی و جمال کے سمندر میں غرق اور دولت و ثروت کے جھولے میں جھولتا ہوتا ہے۔

متعدد عرب ملکوں میں فوجی اور سیاسی انقلابات رونما ہوئے اور بہت سے زعماء اور مصلحین پر زمین تنگ ہوگئی تو انھوں نے لبنان میں پناہ لی اس لحاظ سے لبنان کو عالم عربی کا سوئزرلینڈ کہہ سکتے ہیں، جہاں سیاسی پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد مقیم ہے، اور انھیں

تصنیف وتالیف اور اپنے خیالات کی تبلیغ واشاعت کی مکمل آزادی حاصل ہے جو بہت سے عربی ملکوں میں اور خود ان کے اپنے وطن میں بھی ناپید ہے، انھوں نے اپنی جائدادیں بیروت منتقل کرلیں، اور ان کو کاروبار میں لگایا، تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے نشر واشاعت کا میدان ان کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا، اس لئے اپنا سرمایہ اسی میدان میں لگایا، بیروت میں مشرق کے ...... زبردست عربی پریس تھے، اس بنا پر ان دماغوں کام کرنے والے ہاتھوں اور اس کثیر دولت کے منتقل ہونے سے بیروت کو خاصا فائدہ ہوا، اور تصنیف وتالیف کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں کتب خانوں اور کتاب گھروں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا، مصنفین نے ہر سمت سے اس کا رخ کیا خصوصاً جب قاہرہ میں تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کا بازار سرد پڑا اور آخر میں اس پر پابندی عائد کی گئی تو بیروت نشر واشاعت اور کتابوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔

یہ بیروت پر ایک طائرانہ نظر ہے، طرابلس اور صیدا کے دورے سے فارغ ہونے کے بعد ہم لبنان پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔

طرابلس میں

۲؍رجب ۱۳۹۳ھ مطابق ۳۱؍جولائی ۱۹۷۳ء دوشنبہ کے روز ہم نے طرابلس کا رخ کیا، طرابلس ایک حسین وجمیل اسلامی شہر ہے، بیروت سے ۸۲ کیلومیٹر کے فاصلہ پر آباد ہے، راقم سطور کو اس سے پہلے بھی ایک بار شعبان ۱۳۷۵ھ مطابق اپریل ۱۹۵۶ء میں طرابلس کے مختصر دورہ کا موقع ملا تھا، اور طرابلس اسے بہت پسند آیا تھا، تمنا تھی کہ دوبارہ طرابلس جانے اور وہاں کچھ دن گزارنے کا موقع ملے خدا کا شکر ہے کہ ۱۷ سال بعد یہ موقع ہاتھ آیا، اور ہم دوشنبہ کی صبح کو استاذ حسین القوتلی کے ساتھ طرابلس روانہ ہوگئے، ہم سمندر کے ساحل پر جا رہے تھے

یہ راستہ ہمارے خیال میں مشرق کا خوبصورت ترین راستہ ہے، بحرروم ہمارے ساتھ رواں تھا، اور بہت کم ہم سے جدا ہوتا تھا، صاف ستھری اور خوبصورت بستیوں اور دلکش و دلآویز مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم سرگرم سفر تھے۔

طرابلس پہنچے تو علماء شہر کی ایک جماعت اور محکمۂ قضا و افتاء کے متعلقین نے ہمارا استقبال کیا، سب سے پہلے ہم محکمۂ اوقاف کے صدر دفتر گئے اور اس عظیم مسجد کی زیارت کی جو ابھی تعمیر و تکمیل کے مرحلہ میں ہے، پھر اسلامی یتیم خانہ اور اسلامی شفاخانہ دیکھنے گئے، شفاخانہ کی مجلس انتظامیہ کے صدر شیخ عدنان الجسر نے ہم کو شفاخانہ کی عالی شان عمارت دکھائی جس کی ترتیب و تنظیم جدید طریقہ پر کی گئی ہے، وفد نے صدر کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ نرسوں کو اسلامی لباس اور اسلامی آداب کا پابند ہونا ضروری قرار دیا جائے تاکہ یہ تمام اسلامی شفاخانوں کا شعار اور ان کی خصوصیت بن جائے، ان سب اداروں میں عمدہ ذوق، باقاعدگی اور خوش سلیقگی نمایاں تھی جس کے لئے طرابلس مشہور ہے۔

پھر مدرسۃ الایمان دیکھنے گئے، جو ایک با مقصد مدرسہ ہے، وہاں اتفاق سے مولوی صبغۃ اللہ مجددی سے ملاقات ہوئی جن سے کابل میں ہم مل چکے تھے، وہ لیبیا کی ثقافتی کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے، اور کابل واپس جا رہے تھے کہ اچانک ہوائی اڈہ پر افغانستان کے انقلاب کی خبر سنی تو سفر ملتوی کر دیا، اور صورت حال واضح ہونے تک لبنان ہی میں مقیم رہنے کا فیصلہ کیا۔

پھر وفد طرابلس کے عظیم عالم شیخ ندیم الجسر کی ملاقات کے لئے گیا، جو طرابلس کے نامور اور جلیل القدر عالم شیخ حسین الجسر مصنف "الرسالۃ الحمیدیۃ" کے فرزند ہیں، میں شیخ کی ایک کتاب "قصۃ الایمان بین الفلسفۃ والعلم والقرآن" پڑھ چکا تھا، اور حیدرآباد

میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ پر مغز اور عمیق کتاب یہی نظر آئی ہم برصغیر کے باشندوں نے علامۃ الشام شیخ حسین الجسر طرابلسی کو ان کی کتاب "الرسالۃ الحمیدیۃ" کے ذریعہ جانا تھا جس کو اس صدی ہجری کے آغاز میں بہت مقبولیت و شہرت حاصل تھی، ہندوستان کے علماء اس کتاب کو بہت پسند کرتے تھے، ان کے نزدیک یہ کتاب مذہب اور اسلامی عقائد کا زبردست علمی دفاع ہے، شیخ ندیم الجسر ان کے فرزند ان کے علم کے وارث اور طرابلس کے مفتی ہیں۔

ہمارا قافلہ "سیر" کی طرف روانہ ہوا جو لبنان میں گرمی گزارنے کا ایک دلکش مقام ہے وہ سطح سمندر سے ۰۰ ۹ میٹر بلند ہے، شیخ ندیم الجسر یہیں مقیم ہیں، یہاں شیخ کے دولت خانہ پر دیر تک نشست رہی، شیخ کی گفتگو کا موضوع وہ زیر تجویز فلم تھی جس میں سیرت نبوی کے واقعات اور صحابہ کرام کو دکھایا جائے گا، اور جس کی بعض عرب ملکوں نے منظوری دے دی ہے اس بدعت سے وہ بہت متفکر اور پریشان نظر آتے تھے، ان کا خیال ہے کہ ضعیف احادیث اور سیرت و تفسیر کی وہ کتابیں جو سند و تحقیق کے اعلیٰ معیار پر نہیں ہیں، مستشرقین اور اسلام کے دشمنوں کے لئے بہترین سواد فراہم کریں گی جس کو وہ سیرت کا حسن بگاڑنے اور سیرت کو رومانی افسانوں کے روپ اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والے افسانوی اسلوب میں پیش کرنے کے لئے استعمال کریں گے اور پھر اس پر پابندی لگانا ناممکن ہو جائے گا

طرابلس میں میری تقریر

دوپہر کا کھانا ہم نے "سیر" میں مفتی صاحب طرابلسی کی ضیافت میں کھایا، علماء کی ایک بڑی جماعت شریک تھی، کھانے کے بعد وفد کے خیر مقدم اور تعارف میں ایک تقریر کی گئی،

راقم سطور نے اس خیر مقدمی تقریر کا جواب دیا، اور اہل طرابلس کی کریمانہ ضیافت اور گرمجوشی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"لبنان کے مسلم عوام ایک مخصوص اور نازک صورت حال سے دوچار ہیں جس میں ان کی ذہانت، قوت ارادی اور عقیدہ کی پختگی کا امتحان ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کی نصرت پر پھر اپنے دین کی صلاحیت اور اپنی قوت ارادی پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے لبنان کے مسلمانوں کو اس کار عظیم کا اہل سمجھا اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے منتخب فرمایا، یہ پریشان ہونے اور گھبرانے کا موقع نہیں، صبر و شکر کا موقع ہے، مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالےٰ اس قوم کو کبھی اپنی نصرت و حمایت سے محروم نہیں کرے گا جس کی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتیں ان اسلامی اداروں کی شکل میں جلوہ گر ہیں، جن کو دیکھنے اور جن سے واقفیت حاصل کرنے کا شرف ہم کو حاصل ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کی مدد کرتا ہے، جو کوشش کرتا ہے، دوڑ دھوپ کرتا ہے، زندہ رہنے کا استحقاق ثابت کرتا ہے، اور دشواریوں اور آزمائشوں میں بھی اپنا راستہ نکال لیتا ہے۔"

ملاقات اور تعارف

طرابلس کے دورہ کے اثناء میں وفد نے چند علماء سے ملاقات کی جن میں استاذ جمیل مولوی، شیخ طٰہٰ صابونجی، شیخ رشید میقاتی، استاذ محمد علی ضناوی اور شیخ ناصر الصالح قابل ذکر ہیں، ان حضرات کے ساتھ مختلف اسلامی اور مذہبی موضوعات اور ملک کے سیاسی و اجتماعی حالات

گفتگو رہی اور وفد کو ان کی معلومات اور افکار و خیالات سے استفادہ کا موقع ملا. اس دورہ سے وفد کو بہت مسرت ہوئی اور وہ ان حضرات کا بہت مشکور تھا جنھوں نے اس کا استقبال کیا، اور ملاقات، تعارف اور تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کیا، اس کے بعد وفد بحمدون واپس آگیا۔

صیدا میں

۳ ررجب ۱۳۹۳ھ مطابق یکم اگست ۱۹۷۳ء چہارشنبہ کی صبح کو وفد نے لبنانی شہر "صیدا" کا رخ کیا جو اپنی آبادی اور مرکزیت کے لحاظ سے لبنان میں تیسرے نمبر کا شہر ہے، وفد کے ساتھ ازہر لبنان کے ناظم شیخ خلیل کبی تھے، راستہ بہت حسین اور سفر بڑا دلچسپ اور فرحت بخش تھا، صاف ستھرے اور دلکش لبنانی شہروں اور دیہاتوں سے گزرتے ہوئے ہم صیدا پہنچے جو بیروت سے ۴۳ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔

صیدا پہنچنے کے فوراً بعد وہاں کے محکمۂ اوقاف کے مقامی دفتر گئے اور کچھ دیر نشست رہی، اس موقع پر متعدد دینی شخصیتیں اور علماء موجود تھے، پھر وفد اوقاف کے فاضل مدیر سلیم سوسان کے ساتھ صیدا کے مفتی شیخ محمد انیس حمود کی ملاقات کے لئے گیا، ملاقات بہت خوشگوار تھی، استقبالیہ کمرہ میں دیر تک ہم لوگ بیٹھے رہے، گفتگو ہوتی رہی اور پھر ایک مذاکرہ کا آغاز ہوا جس کا موضوع تھا "مسلمانوں کے اہم مسائل اور وہ عجیب افسوسناک صورت حال جس سے اس دور کا مسلمان دوچار ہے اور اس سے پہلے کی تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی" ہر شخص نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، راقم سطور کی باری آئی، اس کی معروضات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

قوم میں علماء کا منصب و مقام اور عوام پر ان کے بے اثر ہونے کے اسباب

"گفتگو کا دائرہ بہت وسیع ہے، اگر ہم عالم اسلامی کے تمام طبقوں اور حلقوں کا جائزہ لیں گے، اور اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہونے میں ان کی کوتاہی اور پہلو تہی پر گفتگو کریں گے تو کچھ حاصل نہ ہوگا، اور کسی نتیجہ تک رسائی مشکل ہوگی۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اس لئے ہم اپنی گفتگو کو علماء کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں تک محدود رکھیں گے یہ گفتگو مفید بھی ہے، اور عملی بھی، اس لئے کہ اس وقت بھی حضرات علماء ہی تشریف رکھتے ہیں، اور ہمارا روئے سخن انھیں کی طرف ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم کی اصلاح اور درستگی کا دار و مدار علماء کی اصلاح و درستگی پر ہے، علماء اگر صحیح راستہ پر ہوں گے تو قوم بھی صحیح راستہ پر ہوگی، اور اگر علماء میں انحراف ہوگا، بے یقینی اور کمزوری ہوگی، اگر ان کے اندر مادی خواہشات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور حالات کے سامنے جھکنے کا رجحان ہوگا، ان کا معیار زندگی بلند ہوگا، ان کے اندر سادگی اور قناعت کا فقدان ہوگا، وہ تنعم پسندی اور راحت طلبی کے عادی ہوں گے تو اس کا اثر لازمی طور پر مسلم عوام پر بھی پڑے گا اسی موقع کے لئے کسی شاعر نے کہا تھا:

مژدہ باد اے مرگ | عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر ایسی چیز پر فریفتہ ہوتا ہے، جو اس کے پاس موجود نہیں ہوتی، پہلے اسلامی معاشرہ علماء کا ادب کرتا تھا، اور ان کو

بڑے احترام اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، جب وہ زہد و قناعت، بے نیازی و بلند نفسی اور کسی قدر تقشف و سادگی سے مالا مال تھے، یہاں تک کہ سلاطین و امراء ان سے ڈرتے تھے، ان کا احترام کرتے تھے، اور ان کو اپنے سے بلند سمجھتے تھے۔

لیکن آج علماء کا یہ حال ہے کہ وہ بھی راحت طلبی کی دوڑ میں سب کے ساتھ مصروف ہیں، اور اب ان کے درمیان اور ان کے ہم وطن و ہم نسل افراد کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہا، اس لئے معاشرہ بھی انھیں اسی نگاہ سے دیکھنے لگا جس نگاہ سے وہ عوام کو دیکھتا ہے، اور اب لوگوں کے دلوں میں علماء کی کسی نصیحت یا تنقید کی وقعت نہیں پیدا ہوتی۔

دعوت و تبلیغ کے لئے نہایت ضروری ہے کہ علماء اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کریں، اپنا اعتبار اور اپنی دینی اور اجتماعی قیمت کا شعور پیدا کریں، اصلاح و تجدید کی تاریخ میں ہم نے دیکھا ہے کہ جب بھی اسلام اور مسلمان کسی زبردست بحران سے دوچار ہوئے ہیں، ہر طرف ناامیدی اور بے یقینی کے بادل چھا گئے ہیں، ایک عالم نمودار ہوا، اصلاح و جہاد کے میدان میں آیا، حالات کو چیلنج کیا اور تاریخ و واقعات کا رخ موڑ کر رکھ دیا، اسلامی عقائد کی سلامتی اور اسلامی شریعت کی عظمت کے تحفظ کا فرض انجام دیا، قوم کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسے ایک نئی زندگی بخش دی، یہ عمل ہم مسلسل دیکھ رہے ہیں، امام حسن بصری سے شیخ عبدالقادر جیلانی تک، ابن تیمیہ حرانی تک، شیخ احمد سرہندی اور اس صدی کے علماء ربانیین اور ائمہ مصلحین تک ہر زمانہ اور ہر ملک میں

یہ ہوتا آیا ہے، اور قیامت تک اس دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تذکیر کے سلسلہ کو جاری رہنا چاہیے۔

اکثر حاضرین نے اس نکتہ کو تسلیم کیا اور اس کی تائید کی۔

صیدا کا دورہ

پھر ہم "جمعیۃ رعایۃ الیتیم" دیکھنے گئے جو ایک مسلم یتیم خانہ چلاتی ہے، یہ ایک وسیع و کشادہ عمارت ہے، کئی شعبے اور متعدد ہال ہیں، اس کے منتظمین اور قائم کرنے والوں نے اس کی تعمیر و تزیین میں بہت سلیقہ مندی سے کام لیا ہے، اور تمام تکلفات کا لحاظ رکھا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ موجودہ دور کے جدید ترین طرز کے فلاحی اداروں سے کسی طرح سے کم نہیں ہے، اور منتظمین نے اس ادارہ کو "ترقی یافتہ" بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، انھوں نے بعض ایسی سرگرمیاں بھی داخل کر دی ہیں، جو اسلامی شریعت و آداب کے خلاف ہیں، چنانچہ اس ادارہ کے متعلق ایک کتابچہ میں ایک تصویر ہے جس میں اس کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مقامی رقص کی حالت میں دکھایا گیا ہے، طالبات کو خیاطی اور دوسری دستی صنعتوں کے سکھائے جانے پر خوشی ہوئی۔

اس کے بعد ہم صیدا کے قاضی شریعت شیخ سلیم جلال الدین کے گھر گئے جو ایک خوبصورت ٹیلہ پر واقع ہے، یہ ٹیلہ کھیتوں اور باغات سے گھرا ہوا ہے، اس کے سامنے ایک وادی ہے، جس میں سرو قامت درخت کھڑے ہیں، اور رنگ برنگ کے پھولوں اور کلیوں سے بھری ہوئی ہے، اس وادی کا حسن اور ٹیلہ کا قدرتی محل وقوع بہت لطف دے رہا تھا، وہاں علماء اور دوسرے احباب سے ملاقات اور گفتگو رہی اور مناظر قدرت کے ساتھ ساتھ شیرینیٔ گفتار، حسن اخلاق اور

شرافت نفس کے جلوے دل و نگاہ کو مسحور کر رہے تھے۔

پھر وفد نے سمندر کا تاریخی قلعہ دیکھا اور ساحل سمندر پر ایک شاندار ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا اور مسرور و محظوظ بحمدون واپس آ گیا۔

مفتی امین الحسینی کی میزبانی

اسی روز شام کو "موتمر عالم اسلامی" اور "الہیئۃ العربیۃ العلیا لفلسطین" کے صدر مفتی امین الحسینی[1] نے وفد کے اعزاز میں منصوریۃ المتن میں اپنے دولت خانہ پر ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا جس میں علماء، عمائدین شہر اور تحریک اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک تعداد شریک تھی۔

لبنانی مسلمانوں کی صورت حال پر ایک نظر

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم لبنانی مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی صورت حال پر ایک نظر ڈالتے چلیں، یہ ایک پیچیدہ اور مخصوص صورت حال ہے جس کا اندازہ دوسرے ملکوں کے باخبر سیاستداں بھی آسانی سے نہیں لگا سکتے، جس شخص نے لبنان کا دورہ نہ کیا ہو اور وہاں کے حالات پر دقت نظر سے غور کرنے کا موقع اس کو نہ ملا ہو تو وہ اس صورت حال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔

مختصر یہ کہ لبنان کے مسلمان دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں خصوصاً شامیوں کی بغاوت، اتحادیوں کے وعدوں پر اعتماد، اور خلافت عثمانیہ کے دائرے سے خروج کی سزا اور نحوست سے ابھی تک عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں، وہ خلافت عثمانیہ جو اپنی تمام غلطیوں، کوتاہیوں اور

---

[1] افسوس ہے کہ ۴ جولائی ۱۹۷۴ء کو مفتی صاحب اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے (رفیع اللہ)

کمزوریوں کے باوجود اسلامی قوت اور اسلامی اتحاد کا نشان اور مقامات مقدسہ کی محافظ تھی غالباً اس تاوان میں جو عربوں کو ادا کرنا پڑا ہے، اور آج بھی ادا کر رہے ہیں، لبنان کے مسلمانوں کا حصہ شام کے دوسرے باشندوں سے زیادہ ہے، لبنانی مسلمان آج بھی اس پیچیدہ مخصوص اور نرالی صورت حال کے دباؤ سے کراہ رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جبل لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی، اس کے برخلاف ساحل اور بقاع میں مسلمان اکثریت میں تھے، پھر سنہ ۱۹۲۰ء میں بیروت، صیدا، بعلبک، البقاع، حاصبیا اور راشیا کا لبنان سے الحاق عمل میں آیا اور جبل لبنان کو نئی جمہوریہ کی اساس و بنیاد قرار دیا گیا، سنہ ۱۹۳۲ء میں فرانسیسی حکومت نے مردم شماری کرائی جو ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء کو عمل میں آئی، اس مردم شماری کے پیچھے سیاسی اغراض کار فرما تھے، دراصل فرانس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے باشندوں کی تعداد میں ایک فرقہ کو دوسرے پر فوقیت دے دی جائے اسی کے ساتھ ساتھ ایک افواہ یہ بھی پھیل گئی کہ فرانس کا مقصد اپنی نو آبادیات میں فرانسیسی فوج میں جنگ کے لئے جبری بھرتی ہے، اور مسلمان اس سے بچتے تھے، مسئلہ کی پیچیدگی میں اس سے اور اضافہ ہو گیا کہ وہ سوریا کی تقسیم کے مخالف تھے۔

ان تمام اسباب کی بنا پر مسلمانوں نے مردم شماری سے کلی فرار اختیار کیا، نتیجہ ظاہر تھا، چنانچہ اس پر فریب مردم شماری سے عیسائیوں کی اکثریت ثابت ہو گئی، لبنان کے اعلیٰ حکام نے دوسری صحیح اور مکمل مردم شماری کرانے سے انکار کر دیا، اور آج بھی اس کے لئے آمادہ نہیں ہیں، جبکہ پہلی مردم شماری پر چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے

اسی مردم شماری کی بنیاد پر قومی دستور مرتب کیا گیا، عہدوں اور پارلیمنٹ کی نشستوں کی تقسیم انجام پائی اور یہیں سے اس عرب اسلامی ملک میں مسلمانوں کی حیثیت اور مستقبل کا تعین ہوا

اور وہ یہ کہ مسلمان تعداد میں اکثریت کے باوجود اپنے وطن میں اقلیت کی حیثیت سے زندگی گزاریں گے، معاملہ کی سنگینی اس سے اور بڑھ جاتی ہے کہ غیر مسلموں کو لبنانی قومیت پوری فیاضی سے دی جا رہی ہے، اور اس طرح ان کے سیاسی مستقبل کا تحفظ کیا جا رہا ہے۔

فرانس جب لبنان کو چھوڑ رہا تھا تو اس نے حکومت مارونی فرقہ کے سپرد کی اور ایک ایسا دستور (CONSTITUTION) وضع کیا گیا، جس کے رو سے ساری طاقت صدر جمہوریت کے قبضہ میں ہوتی ہے، اور وہ ہمیشہ عیسائی ہوتا ہے، اس کو سب سے زیادہ اختیارات دیئے گئے ہیں، وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوتا، اور وزیر اعظم کو جس کے متعلق دستور میں ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں میں سے منتخب کیا جائے گا، صدر جمہوریہ ہی مقرر کرتا ہے، وزیر اعظم پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، اور پارلیمنٹ جب چاہے، اس کے خلاف اور اس کے وزراء کے خلاف............عدم اعتماد کی تجویز پاس کر سکتی ہے، وزیر اعظم کے پاس مخصوص اختیارات بھی کچھ نہیں ہوتے، حقیقت یہ ہے کہ وہ صدر جمہوریہ کا ہیڈ کلرک ہوتا ہے اگرچہ عملی طور پر "عزت مآب" صدر جمہوریہ کا محافظ اور ڈھال ہوتا ہے۔

یہ تو وہ دستور ہے، جو تحریری شکل میں ہے اور جو لبنانی مسلمانوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتا، اس کے علاوہ وہاں ایک اور دستور بھی ہے، جو کہیں تحریری شکل میں نہیں ہے، وہ ہے وہ طریقہ جس کو لبنانی جمہوریہ اپنائے ہوئے ہے، ان دونوں دستوروں میں نمایاں تضاد پایا جاتا ہے، چنانچہ کلیدی عہدوں پر غیر مسلموں کی اجارہ داری ہے، ترقیاتی پروگراموں، مدارس، ادارے اور وظائف وغیرہ کے مستحق صرف غیر مسلم علاقے ہوتے ہیں، اخلاقی اقدار سے انحراف اور یکساں سول کوڈ کی دعوت مزید برآں جس کی اس ملک کی زندگی میں بہت اہمیت ہے، تعطیل کے ایام حکومت نے جمعہ کے بجائے سنیچر اور اتوار کو مقرر کیا ہے، حکومت

کی سفارشات میں سے ہے کہ ملازمت کی بنیاد فرقہ وارانہ نہ ہو، ان اسلامی علاقوں کو جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ترقی کے مواقع سے محروم رکھا جاتا ہے، اسی طرح جن مسلمانوں نے کسی وجہ سے لبنان چھوڑ دیا تھا، ان کو لبنانی قومیت حاصل کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے[1]

بلاشبہ اس صورت حال کی ذمہ داری لبنانی مسلمانوں پر بھی ہے، اور بہت سی چیزوں کا تعلق ان کی کوتاہ بینی اور حالات کا صحیح اندازہ نہ لگانے سے ہے کیونکہ لبنان کے سارے حالات غیر مسلموں کی جانب سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق رونما ہوئے، اس کے برعکس مسلمانوں نے اس سلسلہ میں کسی منصوبہ بندی سے کام نہیں لیا، ایک سبب مسلم پارٹیوں کے لیڈروں کی انانیت اور سیاسی رہنماؤں کی خود غرضی اور نفس پرستی بھی ہے، جو ہر قیمت پر وزارت عظمیٰ کے عہدہ کو قبول کرتے رہے، خواہ اس سلسلہ میں لبنان کے مسلمانوں کے مفادات اور مصالح کو قربان ہی کرنا کیوں نہ پڑے، ان لیڈروں نے کبھی لبنانی مسلمانوں کے ساتھ مساوات اور ان کے فطری اور شہری حقوق کا مطالبہ نہیں کیا، اور بعض اوقات وزارت عظمیٰ کے عہدہ کو قبول کرنے کے لئے "عزت مآب صدر" کی دعوت پر فوراً لبیک کہا خواہ اس کی مدت چند ہفتوں اور چند دنوں سے زیادہ نہ ہو۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ لبنان کے مسلمان عرب حکومتوں اور عرب دنیا سے بالکل علیحدہ اور الگ تھلگ رہتے ہیں، ان کو کسی عرب حکومت سے کوئی تعاون اور اپنے مسائل کے سلسلہ میں کسی قسم کی ہمدردی حاصل نہیں ہوتی، اس کے برخلاف عیسائی فرقہ کو تمام عیسائی یورپین قوموں، امریکا اور واشنگٹن سے ہر طرح کا تعاون ملتا ہے، پوری عیسائی دنیا اس کی

---

[1] یہ حصہ استاذ محمد علی الضناوی المحامی کی فاضلانہ کتاب "المسلمون فی لبنان مواطنون لا رعایا" کے مطالعہ اور معلومات پر مبنی ہے۔

پشت پناہی کرتی ہے، لیکن مسلمانوں کو عرب اور اسلامی دنیا سے کوئی مدد نہیں ملتی بعض حکومتیں اور بعض عرب ممالک کے دولت مند اور اصحاب خیر حضرات کچھ اسلامی اور فلاحی اداروں کے ساتھ تعاون ضرور کرتے ہیں، مگر اس سے لبنانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کی آئندہ نسلوں کے مستقبل پر جو اس ملک سے وابستہ ہے کوئی اثر نہیں پڑتا، حالانکہ یہ ملک اپنے جغرافی اور سیاسی محل وقوع کی بنا پر بہت اہمیت رکھتا ہے اور عرب ملکوں کے حالات اور مستقبل پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اوپر کے سطور میں یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ غیر مسلم طاقتوں نے لبنان میں مسلم عرب اکثریت کو بے اثر و بے دخل بنانے اور مسیحی فرقہ کو اس علاقہ میں دائمی اقتدار عطا کرنے کے لئے منصوبہ بند طریقہ پر کام کیا، اور سب کچھ ایک مکمل و مرتب اسکیم کے ماتحت تھا، حسن اتفاق سے ابھی حال میں اس کا ایک دستاویزی ثبوت ملا، یہ ایک رازدارانہ تحریر ہے جو حکومت فرانس کی طرف سے عیسائی قائدین اور کارکنوں کی رہنمائی کے لئے مخفی طور پر تقسیم کی گئی تھی، یہاں اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

[یہ اس منشور کا عربی ترجمہ ہے، جو ۱۹۱۹ء میں اتفاق سے لبنان کے ایک کلیسا میں فرانسیسی زبان میں لکھا ہوا ملا تھا۔]

"مادر حکومت کی جانب سے اس کے مخلص فرزندوں کے نام۔

اے یسوع مسیح کے بیٹو!

اے وہ جنھوں نے اپنے عقائد کے تحفظ اور دفاع کے لئے صدیوں تک ذلت و رسوائی کو برداشت کیا، اے شرفاء اطہار! یہ دس نصیحتیں ہمیشہ یاد رکھئے:

(۱) یہ وطن آپ ہی کے لئے وجود میں آیا ہے تاکہ آپ اپنا شیرازہ اکٹھا کر سکیں

اور تاریخی جنگ کے بعد اپنی آزادی سے متمتع ہو سکیں، آپ کو یقین کرنا چاہیے کہ عیسائی کے معنی لبنانی ہیں اور صحرا سے آنے والے عربوں کو صحرا واپس جانا چاہیے

(۲) ہم نے آپ کے لیے وہ تمام اہم انتظامات کر دیئے ہیں جو اس علاقہ میں آپ کی خوشحال زندگی کے ضامن ہیں مثلاً ملکیت اراضی، غیر ملکی ایجنسیاں، سیاسی صورتحال امور زر، اب آپ کا کام یہ ہے کہ ان مفادات کا تحفظ کریں اور ان میں روزافزوں اضافہ کریں۔

(۳) تفریح گاہوں اور سیاحتی انتظامات پر قبضہ کرنے کی کوشش کیجئے اور جب آپ اکثریت میں ہو جائیں تو عربوں کو ان کی بستیوں سے نکال دیجئے، بیروت کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں جہاں مسلمان نہ ہوں ایک ریڈیو سٹیشن کی تعمیر ہرگز نہ بھولیے جس وقت بھی موقع ملے اور حالات سازگار ہوں اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کیجئے۔

(۴) طاقت کے تمام ذرائع اختیار کیجئے مثلاً جسمانی ورزش، اسلحہ اور نوجوانوں کی تنظیمیں، فوج سے دلچسپی لیجئے، اپنی بات پوشیدہ رکھئے، اپنے رفقاء پر اعتماد کیجئے اس لیے کہ دشمنوں کے ساتھ معرکہ بہت طویل اور مسلسل ہے۔

(۵) ادبی قیادت کی زمام اپنے ہاتھ میں لیجئے مثلاً کتابوں کی اشاعت اور تمام انجمنوں اور اکیڈمیوں پر آپ کا قبضہ ہو، ہرگز یہ تسلیم نہ کیجئے کہ آپ کی زبان کا سرمایہ تنہا مسلمانوں کی ملکیت ہے، اور بغیر کسی رو رعایت کے ان تمام افکار و اشخاص سے جنگ کیجئے جو آپ کے رجحانات کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۶) اپنے باہمی اختلافات کو نظری اور سطحی حد سے آگے نہ جانے دیجئے

کیونکہ آپ کی زندگی کا دار و مدار کا فرد شمن کے مقابلہ میں آپ کے اتحاد و یکجہتی پر ہے
اور آپ تو اس یسوع کے فرزند ہیں جس نے ہم کو محبت کا درس دیا ہے۔

(۷) دوسروں کے منصوبوں کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہیے، اور ان کے ساتھ مل کر کام کیجیے تاکہ اندرونی باتوں کا علم ہو سکے، اور ضرورت کے وقت ان کی ظاہری تائید میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن کلیسا اور سرداروں سے ہر شخص کا رابطہ استوار ہونا چاہیے اور اپنے مخلص آباء کے احکام کی نافرمانی نہ کرنی چاہیے۔

(۸) ہر بلند جگہ پر اپنے سروں کو اور اپنے شعائر کو بلند رکھیے اور یقین کیجیے کہ آزاد دنیا کی تمام عظیم طاقتیں بہت جلد آپ کے ساتھ ہوں گی لیکن اپنا کام اس طرح کیجیے کہ گویا آپ کو اس کا قطعاً علم نہیں ہے۔

(۹) طبی اور شخصی خدمات کے ذریعہ عرب بادشاہوں اور سربراہوں سے قریب ہونے کی کوشش کیجیے؛ یہ سہل ترین راستہ ہے، اس سے کام کا وسیع میدان ملے گا، بڑی دولت حاصل ہو گی اور ان ملکوں میں بھی گھسنے کا موقع ملے گا، جن میں آپ کا داخل ہونا دشوار ہے۔

(۱۰) لبنانی قومیت کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے، بڑی ہوشمندی اور باریک بینی سے کام لیجیے تاکہ اپنے اکثریتی حقوق کا تحفظ کر سکیں ورنہ تمام کوششیں رائگاں جائیں گی۔"

دارالافتاء میں ایک اعزازی تقریب

جمعرات کے روز ۴ رجب ۱۳۹۳ھ مطابق ۲ راگست ۱۹۷۳ء کو شیخ حسن خالد مفتی لبنان

نے وفد کے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا جس میں لبنان کے موجودہ وزیراعظم استاذ تقی الدین الصلح، سابق وزیراعظم استاذ صائب سلام، متعدد وزرا مملکت، ممبران پارلیمنٹ، عمائدین شہر، علماء و قضاۃ اور ادبار و مفکرین کی بڑی تعداد شریک تھی۔

لبنان یونیورسٹی اور بیروت کی عربی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر صبحی صالح نے تعارفی تقریر کی، راقم سطور کی تصنیفات خصوصاً "العرب والاسلام" اور تحریک ندوۃ العلماء کا تفصیلی جائزہ لیا، پھر راقم سطور نے تقریر کی جس میں ان حضرات اور ان دوستوں کا شکریہ ادا کیا جن کی بدولت وفد کے قیام اور اس کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں سہولت ہوئی اس کے بعد لبنانی مسلمانوں کے نازک موقف پر احتیاط سے روشنی ڈالی جس ملک میں وہ زندگی گزار رہے ہیں اور جو مسائل ان کو درپیش ہیں ان میں لبنانی مسلمانوں کی کیا ذمہ داریاں اور اس سلسلہ میں اسلام کا ان سے کیا مطالبہ ہے، ان سب باتوں کی وضاحت کی، ذیل میں تقریر کا خلاصہ درج ہے، جو مقرر نے اپنے حافظہ کی مدد سے املا کرایا ہے۔

تہذیبوں کے سنگم اور عالمی اسٹیج پر مسلم قوم کا کردار

"میں اپنی جانب سے رابطہ عالم اسلامی کے وفد کے ارکان اور اپنے رفیق محترم، مشہور اسلامی مصنف، سعودی حکومت کی مجلس شوریٰ کے رکن، جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ کے استاذ اور وفد کے ممبر استاذ احمد محمد جمال کی جانب سے حضرت مفتی اعظم کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہم کو لبنان کے قیام کے دوران اس اعزاز و اکرام سے نوازا، اور میں خاص طور پر حضرت مفتی محترم کا اس لئے بھی مشکور ہوں کہ آپ نے ہمارے لئے اتنی بڑی منتخب جماعت سے ملاقات،

تعارف اور گفتگو کرنے کا مبارک موقع فراہم کیا، جو لبنان کے مختلف طبقوں اور رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے، اگر خود ہم ان تمام حضرات سے ملاقات کی کوشش کرتے تو کبھی کامیابی نہ ہوتی۔

محترم حضرات!

مجھے صورتحال کی نزاکت اور آپ کی عظیم ذمہ داری کا پورا احساس ہے، آپ ایک ایسے ملک میں زندگی گزار رہے ہیں جو مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور مختلف زبان و ادب کا سنگم ہے، آپ کی ذمہ داری بہت عظیم اور آپ کا کام بہت نازک ہے، اور بڑی ذہانت، دور اندیشی، بیدار مغزی ضروری سوجھ بوجھ، پیش بینی اور معاملہ فہمی چاہتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ جس مذہب اور پیغام کے آپ نمائندہ ہیں اس پر پختہ یقین و اعتماد، اور جن غلط فکری دھاروں سے آپ کا سامنا ہے ان کے مقابلہ میں پورے ثبات و استقلال کی ضرورت ہے، اس عالمی اسٹیج پر جس کی طرف ساری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں آپ کو ایک تعلیم یافتہ مسلم اور حکیم و پختہ مومن کا کردار ادا کرنا ہے، آپ کا ہر عمل ہر قدم اور ہر رویہ ریکارڈ ہوتا ہے، اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی اصولوں کی نمائندگی سمجھا جاتا ہے۔

حضرات! آپ دنیا کے سامنے ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلام میں صلاحیت ہے، میں نہیں کہوں گا کہ باقی رہنے کی، میرے نزدیک زندہ رہنے کی صلاحیت اور بقاء کے حق کی بھیک مانگنا کمتر درجے کی چیز ہے، نہیں، بلکہ اسلام میں صلاحیت ہے، قیادت کی، انسانیت کی گلہ بانی کی، ان مسائل کو حل کرنے کی جن سے

دنیا کے سارے مفکرین اور قانون داں پریشان اور عاجز ہیں، اس طرح آپ اپنے دین کی ایسی خدمت انجام دیں گے، جو کوئی قوم اور عرب بلکہ سارے عالم اسلام میں کوئی ملک بھی انجام نہیں دے سکتا، اور حیران و مضطرب عرب دنیا اور عالم اسلام کے سامنے ایک قیادت پیش کر سکیں گے۔

حاضرین کرام!

آپ کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ آپ کو مغربی تہذیب اور عصر حاضر کے چیلنج کا رد اور رد مقابلہ ہے، جو بہت سی دوسری عرب اور مسلم اقوام کو نہیں ہے، آپ مغربی تہذیب کے بحر مواج میں ہیں، آپ ایک نازک آزمائش گاہ اور ایک عملیاتی تجربہ گاہ میں ہیں اور سارا عالم اسلام اس تجربہ اور آزمائش میں آپ کی سربلندی اور کامرانی کے لئے چشم براہ ہے۔

اگر اس رزمگاہ میں آپ فتحیاب ہوئے اور اپنا راستہ نکال لیا تو آپ کے دوسرے ہمسایہ عرب اور اسلامی ملکوں کے لئے بھی راہ کھل جائے گی، بلاشبہ یہ ذہانت و ذکاوت کی آزمائش ہے، ایمان و یقین کی آزمائش ہے، بلند ہمتی اور اولوالعزمی کی آزمائش ہے، اور جن صلاحیتوں اور طاقتوں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے، اور جو مواقع آپ کے لئے فراہم کئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے مجھے پوری امید ہے کہ اس امتحان میں آپ سرفرازی اور سربلندی سے ہمکنار ہوں گے، لبنان میں جو شب و روز ہم نے گزارے ہیں، ان سے ہمارے حوصلوں کو بلندی اور امیدوں کو تازگی اور تقویت ملی ہے، اور جیسا کہ میں نے طرابلس میں کہا تھا، اس ملک میں آپ کے وجود کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

آپ کو اس سیلاب کے روکنے، اسلام دشمن عناصر سے نبرد آزما ہونے اور اس عجیب و غریب ملک میں اسلام کا علم بلند کرنے کا اہل اور حقیقی سزاوار سمجھا ہے آپ کو اس اعتماد اور اعزاز پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت فرمائے، آپ کو ہر مرحلہ پر ثابت قدم رکھے اور آپ کے دلوں کو اتحاد، اخوت اور یگانگت کے جذبات سے معمور فرمائے۔

حضرات! میں نے مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور انسانی معاشروں کا جو محدود مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں، کہہ سکتا ہوں کہ زمان و مکان اور احوال و متعلقات سے قطع نظر، اسلامی تہذیب کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے تو مغربی تہذیب سے زیادہ طاقتور، زود اثر اور اس سے زیادہ نفوذ و رسوخ رکھنے والی کوئی تہذیب آج تک نہیں پائی گئی، مغربی تہذیب انسانی معاشرے کے ہر گوشہ میں داخل ہو گئی، خیالات و جذبات پر غالب آ گئی، زندگی کی قدروں کو بدل ڈالا، سوچنے اور سمجھنے کے انداز پر اثر انداز ہوئی، غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس پر اس کا تسلط اور تصرف نہ ہو، وہ غریبوں کے خس خانوں میں بھی موجود ہے، اور امیروں کے نگار خانوں میں بھی۔

مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب دونوں چونکہ انسان اور انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، اور انسان کے مسائل و ضروریات سے بحث کرتی ہیں، اس لیے کچھ نقطوں پر ان کا اتصال ہوتا ہے، اور کچھ نقطوں پر ان کا افتراق، بعض مواقع پر دونوں کا راستہ ایک ہو جاتا ہے، اور بعض مواقع پر دونوں کے راستے مختلف

ہو جاتے ہیں۔

بحیثیت مفکر اور اسلام کے محرم راز کے، نیز چونکہ اس متضاد ملک میں آپ رہتے ہیں، آپ کا فرض ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کے درمیان ایک باریک اور واضح لائن کھینچ دیں جو فرق و امتیاز کا کام دے ان چیزوں کے درمیان جن کا اخذ کرنا مغربی تہذیب سے صحیح ہو اور جن کا اخذ کرنا صحیح نہ ہو بے حیائی، بے پردگی اور جاہلی زیب و زینت کے درمیان اور اس پردہ اور احتیاط کے درمیان جس کا اسلام نے حکم دیا ہے، لطف اندوزی اور کھیل کود کی اس حد کے درمیان جسے اسلام نے مباح قرار دیا ہے، اور حدود و قیود سے بالاتر ہو کر اس نفس پرستی شہوت رانی اور حیوانیت کے درمیان جو اسلام میں ممنوع قرار دی گئی ہے، ایسی لائن جو باریک بھی ہو اور واضح بھی، اتنی باریک بھی نہ ہو کہ ظاہر نہ ہو اور اس کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ ایسے باریک خط سے کوئی فائدہ نہیں جو لوگوں کو دکھائی نہ دے، اور یہ لائن اتنی موٹی اور بھدی بھی نہ ہو کہ لوگوں کو گزران گزرنے، زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں حائل ہو جائے اور دشواری پیدا کر دے، ایسی لائن جس پر ہر مسلمان جو اپنے دین پر ایمان رکھتا ہو، اور اپنی شریعت کا احترام کرتا ہو آ کر رک جائے اور اس کو پار کرنے کی جرأت نہ کرے، ایسی لائن کسی بھی اسلامی ملک میں جس کا مغربی تہذیب اور عہد حاضر کے فکری دھاروں سے مقابلہ درپیش ہے، موجود نہیں ہے، چنانچہ ایک انتشار پیدا ہو گیا ہے، مسلمان اس تہذیب کے طور طریق اور علوم و افکار سے استفادہ کرنے میں تمام حدود کو پھلانگ گئے ہیں، اور تعلیم یافتہ نوجوان بلکہ ارباب علم و فکر کا

طبقہ بھی" موجودہ صورت حال" کے سامنے یکسر سپر انداز ہو گیا ہے، آپ کے لئے یہ خط کھینچنا زیادہ آسان اور زیادہ ممکن ہے، اس لئے کہ آپ ایسے ملک میں رہتے ہیں، جہاں مغربی تہذیب کا دور دورہ ہے، اور جو اس تہذیب کو اپنانے میں بہت آگے جا چکا ہے، اس کے ساتھ ساتھ آپ ــــ اس وقت میرا خطاب لبنانی دارالافتاء سے ہے ــــ اسلامی روح اور اسلامی قانون کا وسیع اور عمیق علم رکھتے ہیں، میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور میری تمنا ہے کہ آپ اس کارِ عظیم کو بخوبی انجام دیں اس لئے کہ اس کام کا ہماری زندگی اور مسلمانوں کے مستقبل پر بہت گہرا اور ہمہ گیر اثر ہوگا۔

حضرات علمائے کرام!

آپ کی تیسری ذمہ داری میرے نزدیک یہ ہے کہ آپ جس معاشرہ میں زندگی گزار رہے ہیں، اس کے سامنے ایسی چیز پیش کیجئے جو اس کے پاس نہیں ہے، آپ اس خلا کو پر کیجئے، جو بہت دنوں سے پیدا ہو گیا ہے علم و ثقافت، تہذیب و تمدن، اشکال و مظاہر اور عیش و طرب کی زیادتی نے اس معاشرہ کو مرضِ تخمہ میں مبتلا کر دیا ہے، اور انسان کی فطرت ہے کہ وہ اس چیز کی قدر کرتا ہے، جو اس کے پاس موجود نہیں ہوتی اور اس شخص کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کے پاس یہ چیز ہوتی ہے، تو یہ ترقی یافتہ معاشرہ جو علم و تہذیب کے نقطۂ عروج پر ہے، معلومات کی کثرت، علم کی زیادتی، طلاقت لسانی، زورِ خطابت اور آرائش و زیبائش سے زیر نہیں ہو سکتا، وہ زیر ہو سکتا ہے تو اسی چیز سے جو اس کے یہاں نایاب ہے،

جس میں وہ مفلس اور قلاش ہے، وہ قناعت، سادگی، زہد، ضبط نفس، جاہ و منصب کے سحر و طلسم سے آزاد ہونے اور زندگی کے رنگین، خوشنما اور کھوکھلے مظاہر سے بے اعتنائی اسی سے زیر ہوگا۔

یہ معاشرہ اس میدان میں بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے، وہ یہ ماننے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہے، جو اس لذت و راحت کو ٹھکراتا، اور ان "بلند قدروں" کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جن پر ساری دنیا کا ایمان ہے، اور سارے لوگ جن کی پرستش کرتے ہیں۔

آج علم و عقل کا بحران نہیں ہے، مال و مادہ کا بحران نہیں، تہذیب و تمدن کا بحران نہیں ہے، بحران اس زندہ ضمیر کا ہے، جو خریدا نہ جا سکے جو کہیں کھو نہ جائے، جو کسی سودے بازی کو قبول نہ کرے، اس دل کا بحران ہے، جو زندگی اور ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال ہو۔

آج دل و ضمیر کا یہ حال ہے کہ ـــــ میری مراد نہ کسی ایک ملک سے ہے نہ کسی ایک شخص سے ـــــ وہ سامان خرید و فروخت ہو گئے ہیں، جن کی سودے بازی ہوتی ہے، جن کو خریدا اور بیچا جاتا ہے، مسئلہ سامان کا نہیں اس قیمت کا ہے جو ادا کی جاتی ہے، اور جس سے ضمیروں اور اصولوں کو خریدا جاتا ہے، آج سارے لیڈر اور قوم کے ناخدا حکومت کی کرسیوں اور پارٹی کی لیڈرشپ کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، خواہ اس کے حصول میں کوئی قیمت بھی ادا کرنی پڑے۔

بلاشبہ یہ دل و ضمیر اور شخصیت و اخلاق کا بحران ہے جس نے اسلامی ملکوں میں صحیح اور مستقیم قیادت کے بحران کو جنم دیا ہے، اور ایسے بے شمار

مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جن کا کوئی حل نہیں ہے، اور سارے لیڈروں اور قومی رہنماؤں کا اعتماد ختم ہو گیا۔

آپ جو اسلام کے علمبردار اور داعی الی اللہ کے عظیم منصب پر سرفراز ہیں، اس خلا کو پر اور اس شگاف کو بند کر سکتے ہیں، موجودہ معاشرہ اور موجودہ تہذیب کے سامنے زندگی، اخلاق اور شخصیت کا ایک نیا نمونہ پیش کر سکتے ہیں، اور اس طرح مذہب اپنا اعتماد اور علم اور ارباب علم اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک بار پھر میں جمہوریہ لبنان کے مفتی شیخ حسن خالد اور ان کے شاگردوں اور دوستوں کا مشکور ہوں کہ انھوں نے ہماری عزت افزائی فرمائی اور لبنانی مسلمانوں سے ملنے، ان کی سرگرمیوں اور ان کے علمی و فلاحی اداروں سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔"

جن مقامات کو ہم نہیں دیکھ سکے

شیخ مفتی حسن خالد کا بہت اصرار تھا کہ ہم "بقاع" کا دورہ بھی کریں جو ایک بڑا اسلامی علاقہ ہے، اس علاقہ کا ایک وفد بھی ہماری ملاقات کے لئے آیا تھا، اور وہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی، اسی طرح بعلبک دیکھنے کا موقع بھی تھا، جو مشہور تاریخی شہر ہے اور جب ہم نحو کی پہلی کتاب پڑھ رہے تھے اسی وقت سے اس کا نام ہمارے کانوں میں گونجتا رہا ہے، مگر وقت کی تنگی کی بنا پر ہم کو معذرت کرنی پڑی، اور ۵ رجب ۱۳۹۳ھ (۳ اگست ۱۹۷۳ء) کو جمعہ کے روز دمشق جانے کے لئے طے کیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی چیز ہمیں دمشق جانے پر

مجبور کر رہی تھی، تاکہ وہاں ہم کو ایک نئے تجربہ سے دوچار ہونا پڑے اور ہم اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ملاقاتیں

اس دورہ کے اثنا میں جن قابل ذکر ملاقاتوں کا موقع ملا ان میں مجاہد عالم شیخ نمر الخطیب سے ملاقات تھی، یہ ہمارے دیرینہ دوست ہیں، ۱۹۵۱ء سے تعارف ہے میرے دمشق میں قیام کے دوران وہ بھی وہیں مقیم تھے، اس وقت وہ بیروت میں جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیہ کے صدر اور جمعیت کے تحت چلنے والے مدرسۃ الفتح الثانویہ کے ناظم بھی ہیں، یہ لڑکیوں کا مدرسہ ہے ۱۹۶۶ء سے تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے، اس مدرسہ نے لبنان کے مسلم معاشرہ میں ایک بہت بڑے خلا کو پر کیا ہے، اور صالح تعلیم یافتہ اور باشعور خواتین کی ایک نسل تیار کی ہے، اسلامی آداب اور اسلامی شعائر کی پابندی اور تبلیغ میں اس مدرسہ نے لائق تحسین کردار ادا کیا ہے۔

استاذ محمد مبارک سے بھی ملاقات ہوئی جو سوریا کے سابق وزیر، دمشق میں کلیۃ الشریعۃ کے سابق پرنسپل اور کلیۃ الشریعۃ مکہ کے موجودہ استاذ ہیں، اسلامی مفکرین اور مصلحین کی صف اول کے آدمی ہیں۔

استاذ عمر واحوق سے ملاقات ہوئی جو لبنان کی جماعت "عباد الرحمن" کے بانی ہیں اور دعوت و تبلیغ کے کاموں میں قائدانہ حصہ لیتے ہیں۔

مکتب اسلامی بیروت کے مالک استاذ زہیر شاویش سے ملاقات ہوئی جنھوں نے اسلامی مفکرین کی کثیر التعداد علمی اور فکری تصنیفات کو بڑی تحقیق اور اہتمام سے شائع کیا ہے، اسی طرح محب محترم استاذ علی حسن فدعق سے بھی ملاقات ہوئی، جو جدہ کے میئر رہ چکے ہیں، میری ملاقات

ان سے ۱۹۵۰ء سے ہے، جب وہ وزارت مالیہ میں ایک اچھے عہدہ پر فائز اور ریڈیو اور صحافت میں اول اول نمودار ہوئے تھے، انھوں نے بڑی وضعداری اور شرافت کے ساتھ اس تعلق کو قائم رکھا ہے، اور وہ راقم سطور کے مخلص دوستوں میں ہیں۔

یہ لبنان کی تمام اسلامی تنظیموں اور انجمنوں[1] کے تذکرہ اور ان کی جرح وتعدیل کا موقع نہیں ہے، اس کے لئے طویل قیام اور وسیع معلومات کی ضرورت ہے، لیکن بعض انجمنوں اور تنظیموں کی طرف اشارہ نامناسب نہ ہوگا جن کا وہاں کے مسلم معاشرہ پر اثر پڑا ہے، مثلاً جمعیۃ المقاصد الاسلامیۃ، جمعیۃ تعلیم ابناء المسلمین فی القری، مؤسسۃ الخدمات الاجتماعیۃ جمعیۃ المحافظۃ علی القرآن الکریم، جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیۃ فی بیروت، الجماعۃ الاسلامیۃ، یہ ان اداروں اور انجمنوں کے علاوہ ہیں، جن کا ذکر اس مختصر سرگزشت میں آیا ہے۔

سعودی سفارتخانہ کی جانب سے اعزازی تقریب

۴ رجب ۱۳۹۳ھ جمعرات کی شام کو سعودی سفارتخانہ نے وفد کو استقبالیہ دیا جس میں شاہزادہ امیر متعب بن عبدالعزیز (ملک فیصل کے بھائی) عرب اور مسلم حکومتوں کے سفراء، ڈپلومیٹ، عمائدین شہر اور صحافیوں کی بڑی تعداد شریک تھی، یہ وفد کے دورۂ لبنان کی آخری کڑی تھی، اور جمعہ کے روز ۵ رجب ۱۳۹۳ھ (۳ اگست ۱۹۷۳ء) کو دمشق کا سفر طے ہو چکا تھا۔

---

[1] معلوم ہوا کہ ان کی تعداد کئی سو ہے، اور اکثر و بیشتر بیروت میں ہیں۔

دو دن

دمشق میں

ترجمہ

مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی

بیروت سے دمشق

بیروت کے سعودی سفارت خانہ نے دمشق کے سعودی سفارت خانہ سے رابطہ قائم کیا اور اسے اطلاع دی کہ وفد کی بیروت سے دمشق روانگی کا پروگرام جمعہ کے روز ۵ رجب ۱۳۹۳ھ مطابق ۳ر اگست ۱۹۷۳ء کو ہے۔

ہم سویرے ہی سے سفر کے لئے تیار ہو گئے، ہماری خواہش تھی کہ روانگی صبح سویرے ہی ہو، کیونکہ جمعہ کا روز تھا۔ اور ہم کو لبنان اور شام کی سرحدوں سے گزرنا تھا، ان دنوں یہ سرحدیں بند تھیں، مگر ہمارا سفر رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی حیثیت سے ہو رہا تھا، رابطہ عالم اسلامی نے پہلے جدہ اور دمشق کے سرکاری حلقوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا، شام کی حکومت نے وفد کے استقبال اور اس کی میزبانی کے لئے آمادگی بھی ظاہر کی تھی۔

دمشق سے سعودی سفارتخانہ کا ایک نمائندہ بیروت آیا اور وفد کو اس نے اطمینان دلایا کہ حالات معمول کے مطابق ہیں، اور وہ خود سرکاری کارروائیوں کو مکمل کرنے کے لئے ہم سے پہلے ہی "شتورہ" پہنچ گیا، اس کے بعد ہم بھی پہنچے اور ضروری کاموں سے فرصت حاصل کی۔

دمشق سے میرا دیرینہ تعلق

ہم دمشق روانہ ہو گئے، دمشق جہاں میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی زندگی کے خوشگوار ترین لمحات گزارے ہیں، حرمین شریفین کے بعد اگر کسی شہر کو میں اپنا محبوب ترین شہر کہہ سکتا ہوں تو وہ دمشق ہی ہے، میں اس کے بہت سے محلوں، سڑکوں اور باغات و مناظر سے واقف ہوں، دمشق میں میرے عزیز ترین احباب اور دوست تھے، جن سے خاص فکری اتحاد اور مناسبت تھی، اور دمشق کا قیام ہمیشہ میرے لئے خوشگوار و مسرت بخش ثابت ہوا، دل کو سکون اور روح کو راحت نصیب ہوئی، آب و ہوا اس آئی، میں جب شوقی کا یہ شعر پڑھتا تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا تھا:۔

آمنت باللّٰہ واستثنیت جنتہ
دمشق روح وجنات وریحان

ترجمہ:۔ اللہ تعالےٰ پر میرا ایمان ہے، میں اس کی جنت کو مستثنیٰ قرار دے کر کہتا ہوں کہ دمشق سراپا باغ و بہار اور "روح و ریحان" ہے۔

ہم دمشق کی طرف بڑھ رہے تھے، باہر سے آنے والے کے لئے دمشق کا راستہ دنیا کے حسین ترین راستوں میں ہے، معروف اور مانوس مقامات سے ہمارا گزر ہو رہا تھا، حماسی شاعر صمۃ بن عبداللہ کے یہ اشعار میری زبان پر تھے:۔

بنفسی تلك الارض ما أطيب الربى — وما أحسن المصطاف والمتربعا
وليست عشيات الحمى برواجع — عليك ولكن خل عينيك تدمعا

ترجمہ:۔ اس سرزمین پر قربان جاؤں، اس کے ٹیلے کتنے خوشگوار و زرخیز اور

موسم بہار اور گرمی گزارنے کے مقامات کتنے خوبصورت ہیں۔

حمی کی شامیں اب واپس آنے والی نہیں ہیں، اس لئے آنکھوں کو جی بھر کر رو لینے دو۔

میرا دمشق کا پہلا سفر رمضان. ذی القعدہ ۱۳۷۰ھ مطابق جون اگست ۱۹۵۱ء میں ہوا تھا، یہ کرنل ادیب الشیشکلی کا زمانہ تھا، ڈیڑھ مہینہ تک میرا قیام رہا، میں نے تاثرات اپنی ڈائری میں قلمبند بھی کئے تھے[1]۔

دوسرا سفر ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں ہوا اور تین مہینہ تک قیام رہا، یہ سفر دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ کی دعوت پر "وزٹنگ پروفیسر" کی حیثیت سے پیش آیا تھا، اس وقت شکری القوتلی بک صدر جمہوریہ تھے۔

گزشتہ شام کے معاشرہ کی چند جھلکیاں

شام کے معاشرہ اور اس کی عام زندگی کی ان خصوصیات میں جن میں وہ اپنے دوسرے عرب اور پڑوسی ملکوں سے ممتاز تھا، ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ فرق واختلاف سے قطع نظر مذہب کو عوام کے دلوں میں اثر و رسوخ اور ایک خاص مقام حاصل تھا، معاشرہ علماء کا احترام کرتا تھا، ملک میں بہت سے اسلامی اخلاق وآداب اور مشرقی روایات رائج اور باقی تھیں، پورے ملک پر ایک عربی اور اسلامی چھاپ تھی، بے پردگی پہلے دور میں شاذ و نادر اور دوسرے میں کم تھی، اگرچہ وقت اور رجحانات کی تبدیلیوں کے آثار صاف نمایاں تھے، جن کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے بصارت اور معمولی سوجھ بوجھ کافی تھی، اس کے لئے بصیرت اور غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔

---

[1] اس سفر کی تفصیلات کے لئے دیکھئے مصنف کی کتاب "مذکرات سائح فی الشرق العربی" ص ۲۱۸-۳۰۷

خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی، اور حالات کا تقاضا تھا کہ اسلام اور اس ملک کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے مفکرین اور قائدین اس خطرے کی جانب فوراً اپنی توجہ مبذول کریں، مختلف سیاسی نظریات اور مختلف سیاسی پارٹیاں موجود تھیں، وزارتیں تیزی سے ٹوٹ رہی تھیں، حالات میں عدم استقرار اور بے یقینی کی کیفیت رہتی تھی، علماء کے اندر اختلافات تھے، اور ایک کو دوسرے سے مختلف قسم کی شکایتیں تھیں، دینی جماعتوں اور تنظیموں میں اتحاد اور ہم آہنگی مفقود تھی۔

دوسری خصوصیت جس میں شام اپنے عرب پڑوسیوں سے ممتاز تھا، اور جسے باہر سے آنے والا ہر شخص محسوس کرتا تھا، وہ تھی وہاں کی خوشحالی، سکون اور دولت کی فراوانی، زمانۂ قدیم ہی سے اللہ تعالیٰ نے اس ملک کی سرزمین کو زرخیز اور میوہ جات اور سبزیوں سے مالامال کیا تھا، ہر طرف نہریں رواں اور شفاف و شیریں چشمے جاری تھے، باغات اور مرغزاروں کی کثرت تھی، تجارت کو فروغ حاصل تھا، کسب حلال کے دروازے کھلے ہوئے تھے، نہ گرانی تھی نہ اشیاء کی نایابی، نہ بے روزگاری تھی نہ کساد بازاری، بارشیں اپنے وقت پر ہوتی تھیں، پیداوار میں کوئی کمی نہیں تھی، ملک میں مشکل سے کوئی شخص بے کار، حالات سے بددل اور بے زار اور زمانہ کا شاکی نظر آتا تھا، سوائے اس کے کہ کسی شخص کی فطرت ہی شکایت اور ناشکری کی ہو، عوام زندگی کی آسائشوں اور راحتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے، شب و روز بہت سکون اور آرام سے گزرتے تھے، داد و دہش اور خورد و نوش میں بڑی فراخدلی اور وسعت نظر آتی تھی، گرمی گزارنے لوگ پہاڑوں پر (جو دمشق سے تھوڑے فاصلہ پر ہیں) غوطۂ دمشق اور دوسری تفریح گاہوں پر جاتے تھے، اور وہاں دعوتوں اور تفریح طبع کی صحبتیں گرم ہوتی تھیں۔[1]

---

[1] ایسے تفریحی سفروں کے لیے جن کو انگریزی میں "پکنک" کہتے ہیں حجاز میں "قیلہ" اور شام میں "سیران" کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کو ہندوستان کے بعض علاقوں میں "گوٹ" کہتے ہیں۔

میں جب شام کے باشندوں کو ان نعمتوں سے بہرہ مند اور ان راحتوں اور آسائشوں سے متمتع ہوتے دیکھتا تھا، تو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں شام کے باشندے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ان نعمتوں اور آسائشوں کی قدر شناسی میں کوتاہی نہ کریں اور ان نعمتوں کا پورا پورا حق اور شکر نہ ادا ہو پائے۔

اس خوشحال زندگی اور اس پرسکون اور نعمتوں سے بھرپور معاشرہ کی — جو کسی نہ کسی حد تک اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر ایمان رکھتا تھا، اور مشرقی روایات کا پابند اور قدر داں تھا۔ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ افراد کے اندر باہمی اعتماد، خیر خواہی اور ایثار و اخوت کے نیک جذبات موجود تھے، اور اسی وجہ سے اس معاشرہ میں ایک روحانی سکون پایا جاتا تھا۔

ایک یورپین فاضل جو دونوں عالمی جنگوں کے درمیانی وقفہ میں شام گئے تھے، اور عرصہ تک مقیم رہے تھے، اس سے خاصے متاثر اور کسی قدر متعجب ہوئے تھے۔

محمد اسد صاحب (سابق LEO, POLD VEISS) اپنی مشہور کتاب (ROAD TO MECCA) میں دمشق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اہل دمشق کی زندگی میں مجھے ایک روحانی سکون نظر آیا، باہم ایک دوسرے کے ساتھ ان کا جو رویہ اور معاملہ کرنے کا طریقہ تھا، اس میں یہ روحانی سکون اور باطنی طمانیت بخوبی دیکھی جا سکتی تھی۔"

آگے مختلف طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"دکان والوں کے باہمی معاملات کے طور طریق میں بھی یہ چیز نمایاں تھی چنانچہ چھوٹے تاجروں میں بھی جو فٹ پاتھ پر آواز لگاتے ہیں کسی طرح کے خوف و ہراس یا حسد و رقابت کے جذبات نہیں پائے جاتے تھے، اگر کسی دوکاندار کو تھوڑی

کے لئے کہیں باہر جانا ہوتا تو اپنی دکان اپنے پڑوسی اور ہم پیشہ حریف کی ذمہ داری پر چھوڑ کر چلا جاتا تھا، بارہا میں نے دیکھا کہ خریدار ایک دوکان کے سامنے کھڑا ہے، دوکان کا مالک موجود نہیں ہے، خریدار شش و پنج میں ہے کہ دوکاندار کی واپسی کا انتظار کرے یا پڑوس کی دوکان پر جائے، اتنے میں پڑوس کا دوکاندار جو غیر حاضر دوکاندار کا ہم پیشہ حریف ہے آتا ہے، خریدار کی ضرورت دریافت کرتا ہے، اور اس کا مطلوبہ سامان اپنی دوکان سے نہیں بلکہ اپنے غیر حاضر پڑوسی کی دوکان سے دیتا ہے اور قیمت اس کی نشست گاہ پر چھوڑ دیتا ہے، یورپ میں اس طرح کے نمونے کہاں نظر آتے ہیں؟![1]"

بلاشبہ مشرقی ممالک میں بشمول مرکز اسلام زمانہ کی تبدیلیوں اور مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں کے مسموم اثرات کے نتیجہ میں یہ باہمی اعتماد، بھائی چارہ، خیر سگالی اور اجتماعی خیر خواہی کی فضا بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے جس کی بنا پر یہ باطنی سکون اور روحانی اطمینان بھی مفقود ہو گیا ہے۔

لیکن دونوں مرتبہ جب میں شام گیا تھا، تو وہاں کے معاشرہ میں یہ چیز کسی نہ کسی حد تک موجود تھی۔

اخیر دور میں شام کی زندگی اور حالات میں انقلاب

تیسری بار ۱۹۶۳ء کے موسم سرما کے آغاز میں شام جانا ہوا جب میں یورپ سے ہندوستان واپس آرہا تھا، دمشق میں میرا قیام تین روز رہا، شام متعدد فوجی انقلابات

---

[1] الطریق إلی مکہ۔ ص ۱۲۷ ترجمہ "ROAD TO MECCA"

گزر چکا تھا، جنھوں نے زندگی کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا اور پورے معاشرہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، میں نے دیکھا کہ ان دلکش، جانفزا اور روح پرور مناظر میں سے اکثر عنقا ہو چکے تھے، شام گزشتہ خوشحالی اور فراوانی سے محروم ہو چکا تھا، باغات جو وہاں کی اہم ترین اقتصادی بنیاد تھے، پیداوار کی کمی کا شکار تھے، بارش کا سلسلہ اکثر منقطع رہتا تھا، ابلتے ہوئے چشمے خشک ہو چکے تھے، اور پانی کی مقدار بہت کم ہو گئی تھی۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبعی حالات و حوادث ہیں جن کا سیاست اور منصوبہ بندی سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہم اس سلسلہ میں کوئی بحث بھی نہیں کرنا چاہتے، لیکن افسوسناک بات یہ تھی کہ حکومتوں کی بے ثباتی، حکمرانوں کی تبدیلی اور بار بار ملک کی سیاست اور انتظام میں فوج کی دخل اندازی کی بنا پر عوام میں مستقبل سے بے اطمینانی، مایوسی اور بے یقینی پیدا ہو گئی تھی، اور یہ بے اطمینانی اور بے چینی زندگی کے ہر میدان میں نظر آتی تھی خواہ وہ علمی اور تعلیمی میدان ہو یا فکری اور ادبی، سرکاری حلقے، خانگی زندگی، اجتماعی مواقع ہر جگہ یہ چیز نمایاں تھی، دوستوں کی گفتگو میں بھی ظاہر ہوتی تھی، اور ان کے چہروں پر بھی پڑھی جا سکتی تھی، تب مجھے ان انقلابات اور فوجی حکومتوں کے ہولناک نتائج کا اندازہ ہوا، اور معلوم ہوا کہ اشتراکی قائدین ملک کو ترقی دینے، خوشحال بنانے، عزت نفس اور شرافت انسانی کے شعور کو فروغ دینے، امن و سکون پھیلانے اور آزادی خیال عطا کرنے کے جو بے شمار "سرخ" خواب دکھاتے تھے، وہ کس حد تک شرمندۂ تعبیر ہوئے، ان مقاصد کو پورا کرنے کا ذکر ہی کیا جن کا نہ وہ دعویٰ کرتے ہیں، اور نہ جن سے انھیں دلچسپی ہے، بلکہ بعض اوقات تو وہ ان مقاصد اور اقدار کی نفی بھی کرتے ہیں، اور اس کے خلاف برسر پیکار ہو جاتے ہیں، مثلاً مذہب، اخلاق اور روح وغیرہ۔

ان لیڈروں کا نعرہ تھا۔ روٹی بھوکے لئے ایک لقمہ، قوم کی بنیادی ضروریات کی فراہمی، فٹ پاتھ کے آدمی کی کفالت، اور ان کی تگ و دو بھی انھیں مقاصد کے حصول کے لئے تھی، جب یہ مقاصد ہی حاصل نہ ہوئے تو اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ یہ فلسفے "کوہ کندن کاہ برآوردن" کے مصداق ہیں، اور اشتراکیت، قومیت اور کمیونزم سب کے سب غیر عقلی اور غیر انسانی فلسفے اور نظامہائے حیات ہیں، جو محض خوش عقیدگی، خوش فہمی اور جذباتیت پر مبنی ہیں، جن کو عقل، عمل، تجربہ اور نتائج کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا، یا سلبی اصول و مبادی ہیں، جن کا مقصد تخریب یا نظام سے راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

اور اب یہ چوتھا سفر ۷ برسوں کے وقفہ کے بعد پیش آیا، یہ وقفہ ماہ و سال کے حساب سے طویل نہیں تھا لیکن حوادث سے پُر اور بڑی اہمیت کا حامل تھا، اس وقفہ میں ملک متعدد انقلابات سے دوچار ہوا، بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، کتنی حکومتیں آئیں اور گئیں، اسی وقفہ میں ۵ جون ۱۹۶۷ء کا روح فرسا حادثہ پیش آیا، اور ان عرب ملکوں کے نقشہ میں جن کی سرحد اسرائیل سے ملتی ہے، اور جو عرب اسرائیل مسئلہ سے براہ راست دوچار ہیں، بڑی اہم اور عظیم تبدیلیاں وجود میں آئیں، گویا یہ وقفہ مسلم عرب قوم کی تاریخ میں فیصلہ کن وقفہ تھا جس کی جڑیں بہت گہری اور جس کے نتائج و اثرات بڑے دور رس تھے۔

ان قوموں کی زندگی اور حالات میں جن کے سروں پر تلوار لٹک رہی ہے، اور جن کو خطرے کا براہ راست سامنا ہے، میں ان تغیرات اور حادثات کے آثار تلاش کر رہا تھا، کہ میری نظر شامی سرحدوں پر ایک بورڈ پر پڑی جس پر جلی خط سے لکھا ہوا تھا:-

"بعث پارٹی[1] مصنوعی سرحدوں سے باغی اور علاقائیت کی دشمن"۔

میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا کیا صورت حال ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۶ء میں بلکہ سامراجی دور میں بہتر تھی ــــ خصوصاً سرحدوں کے سلسلہ میں ــــ یا اس وقت جب میں شام جا رہا ہوں۔

دمشق میں

خدا کا نام لے کر دمشق میں داخل ہوئے، سعودی سفارت خانہ گئے، سعودی سفیر شیخ محمد مطلق نے ہمارا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ ہمارا قیام "فندق امیۃ الجدید"[2] میں رہے گا، ہوٹل پہنچنے پر معلوم ہوا کہ جمہوریہ شام کے مفتی شیخ احمد کفتارو وفد کے خیر مقدم کے لئے تشریف لائے اور دیر تک بیٹھے رہے، جامع البغا میں ان کی تقریر کا پروگرام تھا، اس لئے چلے گئے، اس سے فارغ ہو کر ہم سے ملاقات کے لئے تشریف لائیں گے، ان کی جگہ پر شیخ بشیر البانی قاضی دمشق اور مفتی صاحب کے فرزند سید زاہر کفتارو موجود تھے، دونوں نے ہم کو خوش آمدید کہا اور شیخ کا سلام پہنچایا، کچھ دیر بعد شیخ احمد کفتارو بھی تشریف لائے، ۱۰ برس کے بعد ملاقات ہوئی، ان ایام کی یاد تازہ ہوگئی، جب ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی، اور "حی اکراد" میں ان کے گھر پر، شیخ محی الدین[3] میں اور غوطہ میں دیر تک ساتھ بیٹھتے تھے اور تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔

---

[1] شام کی حکمراں پارٹی۔

[2] دمشق کا سب سے بڑا ہوٹل جس میں حکومت کے مہمان اور دوسرے ملکوں کے معزز حضرات قیام کرتے ہیں۔

[3] دمشق کا ایک محلہ ہے، شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب ہے، شیخ اسی محلہ میں مدفون ہیں۔

جامع اموی میں

نماز جمعہ ادا کرنے جامع اموی گئے جس کا شدید اشتیاق تھا، اور اسی لئے ہم نے دمشق کے سفر کے لئے جمعہ کا روز طے کیا تھا، جامع اموی میں نماز جمعہ ادا کرنا ایک سعادت بھی ہے، اور اس سے ایک روحانی لذت بھی حاصل ہوتی ہے، میں جب مسجد میں داخل ہوا اور جمعہ کا خطبہ سنا تو شوقی کا دمشقی قصیدہ یاد آیا، اور پھر میری آنکھوں میں آنسو آگئے، جذبات کا ایک طوفان امنڈ آیا، اور ذہن کے پردے پر یاد ماضی کے نقوش ابھر آئے، شوقی اپنے قصیدہ میں کہتا ہے۔

وقفت بالمسجد المحزون أسأله — هل في المصلى أو المحراب مروان

تغير المسجد المحزون واختلفت — على المنابر أحرار وعبدان

فلا الأذان أذان في منارته — إذا تعالى، ولا الآذان آذان

ترجمہ:۔ میں اس غمزدہ مسجد میں کچھ دیر کھڑا رہا، اور دریافت کرنے لگا کہ کیا مصلی یا محراب میں مروان جیسا طاقتور حاکم موجود ہے۔؟

اس حزین و غمگین مسجد نے زمانہ کی نیرنگی کا تماشا دیکھا، اس کے منبر پر کبھی آزاد انسانوں نے قدم رکھا کبھی غلاموں نے۔

اب نہ اذان کا وہ نغمہ ہے، جو کبھی اس کے میناروں سے بلند ہوتا تھا، اور نہ وہ سننے والے ہیں، جو اس کو سن کر تڑپ جاتے تھے۔

ملاقات

ہمارے دوستوں کو ایک طویل عرصہ کے بعد ہمارے دمشق آنے کی خبر ہوگئی، الحکیم

بیشتر تو دمشق چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اب وہی حضرات رہ گئے ہیں، جو یا تو اپنی پیرانہ سالی سے مجبور ہیں، یا انھوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس ملک میں اسلام کی امانت کی حفاظت کریں گے اور اس کو سینے سے لگائے رہیں گے، جس میں ملک شام کو ہمیشہ قیادت و رہنمائی کا مقام حاصل رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ملک شام کی فضیلت میں جتنی صحیح اور کثیر احادیث وارد ہوئی ہیں، کسی ملک اور کسی شہر کے بارے میں وارد نہیں ہوئیں بعض احباب ہماری ملاقات کے لئے خود تشریف لائے اور ہمارا ارادہ تھا کہ بقیہ احباب کے پاس ہم دوسرے دن حاضر ہوں گے۔

شام کی زندگی میں کچھ نئی تبدیلیاں

عصر کے بعد ہوٹل سے نکل کر جب ہم دمشق کی سڑکوں پر جا رہے تھے تو ہم کو دو نئی تبدیلیوں کا احساس ہوا، ایک تو یہ کہ لوگوں کی گفتگو میں رازداری اور بڑھی ہوئی احتیاط محسوس ہوئی جیسے ہر آدمی کو یقین ہو کہ اس پر پہرہ ہے، اور اس کی ہر بات ریکارڈ ہو رہی ہے، ہر شخص قرآن کریم کے اس قول کی تصویر نظر آ رہا تھا۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (قٓ - ۱۸) — وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے۔

بعض قابل اعتماد حضرات نے ہم سے کہا کہ آپ یقین رکھئے، ہر جگہ جاسوس پھیلے ہوئے ہیں، جہاں کہیں آپ کا قیام ہوگا کچھ آنکھیں آپ کی نگرانی میں، اور کچھ کان آپ کی گفتگو سننے میں مصروف ہوں گے، کوئی ہوٹل، کوئی بس، کوئی تفریح گاہ اور پارک اس سے مستثنیٰ نہیں ہے ٹیکسی ڈرائیور، نوکر کسی سے بھی اپنے آپ کو مامون نہیں سمجھنا

چاہیئے۔

دوسری تبدیلی تھی بے محابا بے پردگی، وسیع پیمانے پر اور عجیب وغریب قسم کا جنسی اختلاط، راستوں اور سڑکوں پر ہر طرف فحش تصویریں اور جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اشتہارات چسپاں اور آویزاں تھے، ہپّی نوجوان بڑی تعداد میں موجود تھے، اور ہم کو اندازہ ہوا کہ جو شہر اپنی قدامت پسندی اور وضعداری کے لئے مشہور تھا آزادی، بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط میں بہت آگے جا چکا ہے، یہ بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط اکثر حالات سے بد دلی کا نتیجہ اور ناکامیوں اور شکستوں کا ردعمل ہوتا ہے جس میں قوم کے افراد جن کے دل زخمی اور احساس کمتری میں گرفتار ہوتے ہیں، ایک طرح کی تسکین پاتے ہیں، دوسری طرف خود حکومت کے ذمہ داروں اور قائدین کی طرف سے ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے کہ لوگوں کو ان سے محاسبہ، صحیح اسباب کی تلاش اور تنقید کی فرصت ہی باقی نہ رہے، اور ساری قوم خود فراموش اور مست بن کر رہے، پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ میں یہ پیش آیا تھا، اور مصر میں ۵ رجون کے حادثہ کے بعد یہی ہوا۔

ان دونوں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جن کا تعلق زندگی کی اخلاقی اور معنوی قدروں سے ہے، ایک تیسری تبدیلی بھی نظر آئی، ملک اقتصادی پسماندگی اور کسی قدر بدحالی کا شکار ہے آمدنی کے ذرائع تقریباً مفقود ہیں، شام اس خوشحالی سے محروم ہو چکا ہے جس میں گزشتہ عہد میں اسے امتیاز اور شہرت کا درجہ حاصل تھا، میں نے اس کی توجیہ یہ کی کہ شام اور لبنان کے درمیان سرحدیں بند ہیں، اس لئے ممکن ہے، یہ ایک ہنگامی صورت حال ہو، مگر پھر معلوم ہوا کہ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے، کیونکہ میں نے دیکھا کہ لوگ اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں، ایک گھٹن محسوس کر رہے ہیں، اور ان کو گزشتہ خوشحالی کی خوشگوار یادیں ستاتی ہیں،

جب دولت کی فراوانی تھی، لوگ امن وسکون کی زندگی گزار رہے تھے، اور شام اس آیت کریمہ کی تصویر نظر آتا تھا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔ (النحل ۔ ۱۱۲)

اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن واطمینان میں (رہتے) تھے (اور) ان کے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار طرف سے ان کے پاس پہونچا کرتی تھیں۔

ماضی اور حال میں یہ نمایاں فرق مجھے ہر جگہ محسوس ہوا اور عام فضا اور عام احساس یہی تھا، مگر میں نے اس کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی، میں نے کہا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، قوموں کی زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، اگر ملک باعزت، مستحکم اور طاقتور ہو، اس کی سرحدیں محفوظ ہوں، اس کی طرف دشمن نگاہ اٹھانے اور اس پر دست درازی کرنے کی جرأت نہ کر سکتا ہو، اور اس کی زمین کا ایک ایک انچ اس کے باشندوں کے قبضہ میں ہو تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، بسا اوقات ملکوں اور قوموں کو اس طرح کے ہنگامی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور ایک طویل عرصہ تک کفایت شعاری اور تنگی کی زندگی گزارنی پڑتی ہے، لوگ صرف سدرمق کے لئے کھاتے اور تن ڈھانکنے کے لئے پہنتے ہیں، تفریح وتعیش کے سامان (LUXURY) سے محروم رہتے ہیں، مشرق اور مغرب کی بعض قوموں نے برسوں تک یہ زندگی گزاری ہے اور کسی طرح کی پریشانی اور اضطراب کا مظاہرہ نہیں کیا، آخر کار مشکلات ومصائب کے بادل چھٹ گئے، بحران ختم ہو گیا، اور کشادگی وخوشحالی کے ایام واپس آ گئے، عرب اور مسلم اقوام کو تو بدرجۂ اولیٰ اس صبر، استحکام اور استقلال کا ثبوت دینا چاہئے کہ ان کا دین اسی کی تعلیم دیتا ہے

ان کے سامنے اسوۂ رسول اور صحابۂ کرام کی زندگی کا نمونہ ہے، اور اس پر ثواب کے بڑے بڑے وعدے ہیں۔

لیکن توجیہ اور تاویل کی ساری عمارت زمین پر آ رہی، جب میری نظر جولان (گولان) کی بلندیوں پر پڑی جن پر اسرائیل کا تسلط ہے جس کی وجہ سے شام اور خود دمشق ایک دائمی خطرہ سے دوچار ہے، اور اسی سے ملک کا مستقبل وابستہ ہے، جب تک گولان پر یہودیوں کا قبضہ ہے، شام کا وجود اسرائیل کے رحم وکرم پر موقوف ہے، معلوم ہوا کہ گولان پر اسرائیل کا استیلا بغیر کسی جنگ یا کشمکش کے ہوا تھا، شام کے باشندوں اور خود محاذ جنگ پر برسرِ پیکار فوج کے لئے بھی یہ ایک خلاف توقع بات تھی جو بالکل ڈرامائی انداز میں پیش آئی۔

ملاقاتیں

شیخ احمد کفتارو کے ساتھ شارع مطار پران کے خوبصورت اور وسیع فارم پر دلچسپ مجلس رہی تصوف اور تزکیۂ نفس کی ضرورت، گہری دینی تربیت اور موجودہ زمانہ میں دعوتؑ تبلیغ کے اصول اور صحیح طریقۂ کار کے موضوع پر تبادلۂ خیال رہا غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت اس کی نشاۃ ثانیہ اور مستقبل کے بارے میں شیخ بہت پر امید نظر آتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اگر مخلص وصاحب حکمت مبلغین اور داعی الی اللہ تیار ہو جائیں، جو صحیح داعیانِ اسلام کے اوصاف سے متصف ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ دین کی طرف راغب نہ ہو، انھوں نے بڑی تفصیل سے اپنے دعوتی اور تبلیغی تجربات کا تذکرہ کیا، ان کو امریکا اور روس کے دوروں میں جو انھوں نے ابھی حال میں کئے تھے، جو خوش آئند تجربے ہوئے اور وہاں کے ذمہ داروں اور نوجوانوں نے جس توجہ سے ان کی بات سنی اس کا وہ دیر تک

تذکرہ کرتے رہے۔

صبح کبھی شیخ کی دعوت پر ہم لوگ ان کے فارم میں گئے اور دیر تک نشست ہوئی، طے ہوا کہ اتوار کے دن وزیر اوقاف جناب عبدالستار السید سے ملاقات کریں گے، وہی ہمارے دورہ کا پروگرام مرتب کریں گے، پھر بعض تاریخی مقامات دیکھنے گئے اور بعض مسلم محلوں میں جانا ہوا، ہوٹل میں ہمارے پہنچنے کے دن ہی شام کو شام کے جلیل القدر عالم اور دینی پیشوا اور مربی شیخ حسن حبنکہ[1] تشریف لائے اور انھوں نے اگلے دن ہم کو کھانے پر مدعو کیا جس کو ہم نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا، اور ہفتہ کے روز ان کی قیام گاہ پر دوپہر کا کھانا کھایا، اس موقع پر ان کے خاندان کے چند افراد اور شہر کے وہ علماء تھے جن کا ان سے شاگردانہ و نیازمندانہ تعلق ہے، دوستانہ اور برادرانہ مجلس رہی گفتگو کا موضوع تھا "اسلامی شریعت اور اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام اور وہ طبعی کمزوریاں اور خوبیاں جو عورت کی خصوصیت ہیں۔"

دمشق کے سعودی سفارتخانہ نے طے کیا کہ اتوار کو وفد کے اعزاز میں سفارتخانہ میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے گا جس میں وزراء، سفراء، علماء اور عمائدین شہر کو دعوت دی جائے گی، ہم نے طے کیا کہ دوشنبہ کی صبح کو حلب جائیں گے۔ اور راستہ میں ایک دو گھنٹہ کے لئے حمص اور حماۃ میں بھی ٹھہریں گے، اور پھر چہارشنبہ کو دمشق واپس آجائیں گے، دمشق میں دو دن قیام رہے گا

---

[1] شیخ حسن حبنکہ اس وقت شام کے سب سے مقبول اور ہردلعزیز عالم ہیں، وہ اپنی اصول پسندی، حکومت سے بے نیازی اور پاکیزہ زندگی کی وجہ سے عوام و خواص میں یکساں طریقہ سے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، دمشق کے مشہور محلہ میدان میں جو ہمیشہ سے علماء کا مرکز رہا ہے۔ اور جس کی حیثیت دمشق میں تقریباً وہی ہے جو لکھنؤ میں فرنگی محل کی ہے، ان کا مکان اور آزاد دینی مدرسہ تھا، حکومت شام نے اس کو سرکاری انتظام میں لے لیا اور ان کو بے دخل کر دیا، اب بھی وہ درس و تدریس اور وعظ و تذکیر میں مشغول رہتے ہیں۔

اور اس اثنار میں مختلف جلسوں اور تقریبات میں شرکت کی جائے گی، ملاقاتوں وغیرہ کا پروگرام رہے گا، جسے مفتی صاحب اور وزیر اوقاف مشورہ سے مرتب کرلیں گے، پھر ان شاء اللہ عمان روانگی ہوگی۔

عصر کے بعد شیخ سید مکی الکتانی[1] سے ملاقات کے لئے دمشق کی گرمی گزارنے کی مشہور جگہ زبدانی گئے، شیخ عرصے سے خانہ نشین اور صاحب فراش ہیں، چلنے پھرنے سے معذور ہیں دو سال سے رابطہ کے اجتماعات میں بھی شرکت نہیں کرسکے ہیں، کچھ دیر تک بڑے پرسکون اور خوشگوار ماحول میں ملاقات رہی ان کا خاندان قدیم زمانہ سے مذہبی اور علمی خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، علم و دین کی خدمت اور علمار کی تنظیم میں شیخ نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

خواب جو حقیقت تھا

۱۰ بجے رات میں ہم ہوٹل واپس آئے، دمشق کے بعض دوستوں اور اپنے بعض شاگردوں کو جنھوں نے ندوۃ العلمار میں تعلیم حاصل کی ہے، وقت دے چکے تھے، لبنان کی بعض تقریریں جو قلمبند نہیں ہوسکی تھیں ان کو بھی ان دوستوں کی مدد سے قلمبند کرنے کا خیال تھا، بعض عزیزوں کی معیت میں قدیم دوستوں اور دمشق کے بزرگوں کی ملاقات کے لئے جانا تھا

---

[1] سید مکی کتانی شام کے مشہور عالم، شیخ طریقت اور رابطۃ العلمار یعنی شام کی جمعیۃ العلمار کے صدر اور رابطۂ عالم اسلامی مکہ کے ممتاز رکن تھے، ان کا خاندان مغرب اقصیٰ کا مشہور حسنی سادات کا خاندان ہے جو کتانی کے نام سے مغربی اور مشرقی ممالک میں مشہور ہے، اس خاندان میں بڑے بڑے محدث اور صوفی گزرے ہیں، سید مکی کتانی کے والد سید جعفر کتانی جلیل القدر محدث اور شیخ طریقت تھے، انھوں نے مغرب سے آکر دمشق میں بود و باش اختیار کی، افسوس ہے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں سید مکی کتانی صاحب نے اس دار فانی سے رحلت کی رحمہ اللہ تعالیٰ وغفر لہ۔

جن سے شام کے گزشتہ سفروں میں ایسے روابط قائم ہو گئے تھے، جن میں مرورِ ایام سے کوئی کمزوری نہیں آئی، جیسے علامۃ الشام شیخ محمد بہجۃ البیطار، سابق مفتی شام ڈاکٹر ابوالیسر بن عابدین[۱]، شیخ احمد الدقر صدر الجمعیۃ الغراء[۲]، اور شیخ زین العابدین[۳]، ان حضرات میں بعض مریض رہتے ہیں، اور بعض ضعیف ہو چکے ہیں، مجمع اللغۃ العربیۃ بھی جانے کا خیال تھا جس کا ۱۹۵۶ء سے میں رکن ہوں، اسی طرح صحابۂ ائمہ اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزارات کی زیارت کرنی تھی۔

ہم بستر پر دراز ہو گئے، ہر شخص تھکا ہوا تھا، حالات معمول پر تھے، کوئی نئی اور پریشان کن بات نہیں معلوم ہوتی تھی، میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے اپنے بھانجے مولوی محمد رابع سلمہٗ کو ہوٹل کے ایک ملازم سے ٹیلیفون پر گفتگو کرتے ہوئے سنا۔

"وہ نیچے ہیں یا اوپر چڑھ آئے ہیں؟"

"نہیں وہ اوپر پہونچ گئے ہیں"، ہوٹل کے ذمہ دار نے جواب دیا۔

---

[۱] یہ بزرگ ردالمحتار جس کو عام طور پر "شامی" کہتے ہیں، کے مصنف علامہ ابن عابدین کے ... پرپوتے ہیں، میڈیسن کے ڈاکٹر تھے لیکن اپنی دینی تعلیم، خاندانی ذوق اور ذاتی مطالعہ سے کئی سال تک مفتی جمہوریہ کے اہم عہدہ پر فائز رہے، دینی حلقوں میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

[۲] شام کے مشہور شیخ طریقت اور استاذ و مربی شیخ علی الدقرؒ کے فرزند جو شام میں متعدد دینی مدارس کے بانی اور علماء کی ایک کثیر تعداد کے استاد و مربی تھے۔

[۳] شیخ زین العابدین شیخ محمد الخضر حسین تونسی کے برادرِ اصغر جو مصر کی مشہور علمی و دینی شخصیت اور سابق شیخ الازہر تھے، بہت معمر بزرگ اور ذی استعداد عالم ہیں۔

اور پھر ہم نے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنی، دروازہ کھول دیا گیا اور تین اشخاص جو شہری لباس میں تھے، کمرہ میں گھس آئے اور ہم سے کہا "سامان باندھیے اور تشریف لے چلیے"!

"کہاں؟" ہم نے دریافت کیا۔

"معلوم نہیں" جواب ملا۔

اس کے بعد وہ استاذ احمد محمد جمال اور استاذ عبداللہ باہبری سے ملے اور ہم کو ایک دوسرے سے ملنے سے روک دیا، ہم کو یقین ہو گیا کہ کسی نئی صورت حال سے ہم دوچار ہونا ہے۔

استاذ احمد محمد جمال نے سعودی سفیر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کو صورت حال سے آگاہ کریں مگر اس کی اجازت نہیں دی گئی، استاذ نے اس غیر مہذب اور کرخت رویہ پر احتجاج کیا اور کہا کہ "ہم کوئی بھیڑ بکری نہیں ہیں کہ ہم کو زبردستی ہانکنے کی کوشش کی جائے، ہم سبب دریافت کرنا چاہتے ہیں"! مگر احتجاج بے سود رہا۔

پھر ہم ایک کار میں سوار ہوئے جو ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی، ہمارے ساتھ وہ لوگ بھی سوار ہوئے، اور راستہ میں ہم کو پتہ چلا کہ ہم لبنانی سرحدوں کی سمت جا رہے ہیں، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں لے جائے جا رہے ہیں۔

ساری کارروائیاں بڑی تیزی سے انجام پائیں، ہم ایک لبنانی کار میں منتقل ہو گئے جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہلے سے اسی مقصد کے لئے وہاں موجود تھی، اور ہم نے بیروت کا رخ کیا، بیروت صبح سویرے پہنچے، بیروت میں دوستوں کو جنھوں نے دو روز پہلے ہم کو رخصت کیا تھا، دوبارہ بیروت اچانک واپسی پر بہت حیرت ہوئی، اسی طرح دمشق میں

ہمارے احباب کو نصف شب میں اچانک شہر چھوڑنے پر خاصی تشویش اور حیرت ہوئی اور اس کی کوئی وجہ ان کو معلوم نہیں ہو سکی۔

یہ سب کچھ ایک ڈرامائی انداز میں پیش آیا جس کے سین بہت مختصر تھے، ہمارے لئے تو یہ ایک خواب تھا جس کا آغاز بہت لذیذ اور جس کا انجام پریشان کن تھا، ہم گمان و یقین کی درمیانی کیفیت میں مبتلا تھے، اور فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ یہ سب کچھ عالم خواب میں پیش آیا، یا عالم بیداری میں، اس میں ذمہ داروں کا اشارہ اور ارادہ شامل تھا، یا ان کی لاعلمی میں پیش آیا۔

قرآن مجید میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ	موسیٰ شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب
مِّنْ اَهْلِهَا۔ (القصص۔ ۱۵)	شہر کے سب لوگ نیند اور غفلت میں تھے۔

ہمارا حال اس کے برعکس تھا، ہم شہر سے نکلے اس وقت جب سارے لوگ گہری نیند سو رہے تھے، اور کسی کو ہماری خبر نہ تھی۔

اس طرح دمشق کا دورہ بہت مختصر رہا، اور کتنی خواہشیں اور آرزوئیں تھیں جو ناتمام ہی رہ گئیں۔

بیروت کے اخبار "الحیاۃ" نے اس واقعہ کی خبر ۸ رجب ۹۳ھ مطابق ۶ اگست ۷۳ء کو دوشنبہ کے روز شائع کی اور اس سے بیروت میں ہمارے دوستوں کو اس واقعہ کا علم ہوا، اسی روز بی بی سی لندن اور اسرائیل ریڈیو نے بھی یہ خبر نشر کی اور بیروت اور دوسرے عربی ممالک کے اخبارات نے اس واقعہ پر تبصرہ کیا، اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

بیروت میں سارے دوست واحباب ملاقات کے لئے آتے، واقعہ کی تفصیلات دریافت کرتے، محو حیرت ہوتے اور مسئلہ سے دلچسپی کا اظہار کرتے۔
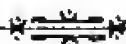
ہارون رشید کے پایۂ تخت

بغداد میں

ترجمہ

مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی

اسلامی ثقافت وتاریخ میں بغداد کا مقام

اسلام کی سیاسی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کا جتنا بڑا حصہ بغداد سے متعلق ہے، اتنا کسی دوسرے اسلامی شہر یا دارالسلطنت سے نہیں ہے، جتنے واقعات اور افسانے بغداد سے وابستہ ہیں، اتنے کسی دوسرے شہر سے وابستہ نہیں ہیں، بغداد اسلامی دور میں چمکا، پوری پانچ صدیوں تک عباسی حکومت کا دارالسلطنت رہا، زمانۂ قدیم میں متمدن دنیا کے بیشتر حصہ پر حکمرانی کی، ہر علم وفن کے امام پیدا کئے، دنیا کے گوشہ گوشہ سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین نے اس کا رخ کیا اور وہیں بود وباش اختیار کرلی، یہی وجہ ہے کہ ماہرین فن اور عظیم دانشوروں کی اتنی بڑی تعداد کا اجتماع کسی بھی دوسرے اسلامی شہر میں نہیں ہوا۔

بچپن میں دور دراز شہروں میں سے مکہ اور مدینہ کے بعد جس شہر کا نام سب سے پہلے کانوں میں پڑا، وہ بغداد ہی تھا، پہلی کتاب جس سے ہم نے حروف تہجی کی تعلیم حاصل کی وہ قاعدۂ بغدادی تھی، یہ قاعدۂ بغدادی ہی درحقیقت پورے اسلامی کتب خانہ کا دروازہ اور

قرآن وحدیث، اسلامی علوم وفنون اور اردو وفارسی زبانوں کی طرف لے جانے والا راستہ ہے۔

اسلامی تاریخ، صرف ونحو اور تینوں فقہی مکاتب فکر (حنفی، شافعی، حنبلی) کے مطالعہ میں جو راستہ اختیار کرتے تھے، وہ یا تو بغداد سے گزرتا یا بغداد ہی سے نکلتا یا بغداد ہی جاتا تھا، چنانچہ افکار ونظریات کے نشوونما کوفہ وبصرہ، معتزلہ واشاعرہ اور اسی طرح متکلمین ومحدثین کے اختلافات کی جو تاریخ بھی لکھی جائے گی، اس میں بغداد کا حوالہ اور اس کی جانب اشارہ ضروری ہے۔

یہی مقام تھا جہاں امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ابتلا پیش آیا تھا، جس میں آپ نے غیر معمولی صبر واستقلال کا مظاہرہ کیا تھا، یہیں امام غزالی کے وہ حلقہائے درس قائم ہوتے تھے، جن پر خلفاء کی مجلسیں بھی رشک کرتی تھیں، یہیں علامہ ابن الجوزی کی وعظ ونصیحت کی مجلسیں گرم ہوتی تھیں، جن میں اللہ کے نیک اور صالح بندے کثرت سے شریک ہوتے تھے، یہیں شیخ عبدالقادر جیلانی کا وہ مدرسہ تھا، جو تعلیم وتزکیہ دونوں کا جامع تھا، یہیں زہد وتقوی اور عفت وپاکبازی کی وہ زندگی گزری تھی، جس کی تصویر ہمیں ابونعیم اصفہانی کی کتاب "حلیۃ الاولیاء" اور ابن الجوزی کی "صفۃ الصفوۃ" میں نظر آتی ہے، اور یہیں لہو ولعب اور رقص وسرود کی وہ آزاد اور رنگین زندگی بھی بسر ہوئی ہے، جس کے نمونے ہمیں ابوالفرج اصفہانی کی کتاب "الاغانی" اور گمنام مولفین کی مشہور کتاب "الف لیلہ ولیلہ" میں ملتے ہیں، بغداد ان دونوں طرز کی زندگیوں اور دونوں قسم کے رجحانات میں قیادت وسربراہی کا مقام رکھتا تھا، مذکورہ کتابوں میں سے ہر کتاب بغداد کی اس متضاد زندگی کے ایک نمونہ کی نمائندگی اور تصویر کشی کرتی ہے، بغداد جہاں دولت دجلہ وفرات کی طرح بہتی تھی، جہاں خیر وشر دونوں کے محرکات

موجود تھے، جہاں "اصلاح" اور "افساد" دونوں کی دعوتوں اور تحریکوں کے علمبردار موجود تھے، ہر بڑے شہر اور دارالسلطنت پر جس کی چھاپ تھی۔

—— تو بغداد کا سفر ضروری ہے، خواہ کتنا ہی طویل ہو اور ہمیں اندیشہ لاحق ہوا کہ خدانخواستہ یہاں بھی اسی حادثہ سے دوچار نہ ہونا پڑے جو دمشق میں پیش آیا تھا۔

بیروت سے بغداد

بغداد لے جانے والے طیارے کے انتظار میں ہم نے تین دن بیروت میں گزارے لبنانی طیارہ کا وقت دوشنبہ، ۷ اگست ۱۹۵۱ء تھا، بیروت کے سعودی سفارتخانہ نے بغداد کے سعودی سفارتخانہ سے رابطہ قائم کیا، اور بغداد کے سعودی سفیر نے سرکاری حلقوں سے رابطہ قائم کرکے ہمیں بتایا کہ عراقی حکومت وفد کو خوش آمدید کہتی ہے، اور ۵ دن تک وفد کی میزبانی کے لئے آمادہ ہے۔

دوشنبہ کے روز عشا کے وقت ہم خدا کا نام لیکر روانہ ہوئے، اور تقریباً نصف شب میں بغداد پہنچے، سعودی سفیر عزت مآب علی صقر، عراقی مجلس اوقاف کے نائب صدر عبدالرزاق قیام، علماء بغداد کی ایک جماعت اور سعودی سفارتخانہ کا عملہ ہمارے استقبال کے لئے ہوائی اڈہ پر موجود تھا، ایک گھنٹہ تک ہوائی اڈہ کے استقبالیہ ایوان میں رہے، جہاں حضرات علمائے کرام سے تعارف ہوا، جن میں سے بیشتر اوقاف سے متعلق نیز مساجد ملک کے امام و خطیب اور مدارس کے اساتذہ تھے، پھر ہم نے امبیسڈر ہوٹل کا رخ کیا، یہ دجلہ کے سامنے شارع ابو نواس پر ایک عظیم الشان ہوٹل ہے، بغداد میں شدید گرمی تھی، باد سموم کے تند جھونکے چل رہے تھے لیکن ہوٹل ایرکنڈیشنڈ تھا، اس لئے رات بڑے سکون اور آرام سے گزری۔

سرکاری ملاقاتیں اور دورے

دوسرے روز ۲۰ اگست ۷۳ء کو چہار شنبہ کی صبح کو وفد کی سرگرمیاں شروع ہوئیں، پہلے دیوان الاوقاف گئے، وہاں معلوم ہوا کہ ہمارا پروگرام جس کی روشنی میں ہم کو نقل و حرکت کرنا ہے، وزارت خارجہ مرتب کرے گی، وہی ملاقاتوں اور دوروں کا آئین طے کرے گی، وزارت خارجہ نے ہمارے لئے ایک رفیق سفر مقرر کیا، جو وزارت ہی کا ملازم تھا، اسی کی رفاقت اور نگرانی میں ہم کو چلنا پھرنا تھا، بعد میں محسوس ہوا کہ حکومت کی جانب سے دو اشخاص اور بھی متعین ہیں، جو ہمارے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ہمہ وقت ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں۔

دیوان الاوقاف سے قصر جمہوری گئے، جہاں "سجل التشریفات"[له] میں اپنا نام درج کرایا ہمارے سرکاری رفیق سفر نے بتایا کہ اس کا قوی امکان ہے کہ صدر جمہوریہ احمد حسن بکر ملاقات کے لئے ہم کو بلائیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ بغداد سے باہر کہیں کا سفر نہ کیا جائے۔

سب سے پہلے ہم نے امام اعظم (ابو حنیفہؒ) کی مسجد کی زیارت کی، ظہر کی نماز ادا کی، امام صاحب کے وفادار اور لائق شاگرد اور حنفی مسلک کے اہم ستون امام ابو یوسفؒ کی مسجد دیکھی، عصر کے بعد سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے "الحضرۃ القادریۃ"[عله] گئے، آپ ہی کی مسجد میں نماز عصر ادا کی، سیدنا جیلانیؒ کی خانقاہ کے احاطہ میں ایک کتب خانہ بھی ہے اس کو دیکھا

له وہ رجسٹر جس پر مملکت میں آنے والے معزز مہمان دستخط کرتے ہیں، اور جو صدر جمہوریہ کے سامنے پیش ہوتا ہے، یہ مملکتوں کی ایک اخلاقی رسم ہے، جو باہر سے آنے والے ممتاز اشخاص کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

عله وہ جگہ جہاں شیخ عبد القادر جیلانیؒ بغداد میں مدفون ہیں، "الحضرۃ القادریۃ" یا "الحضرۃ الکیلانیۃ" کے نام سے مشہور ہے۔

اور پھر کچھ دیر کے لئے کاظمیہ[1] گئے۔

جمعرات کی صبح کو بعض وزراء کی ملاقات کے لئے نکلے جن کا نام سرکاری پروگرام میں درج تھا، ان میں ابتدائی اور صنعتی تعلیم کے وزیر استاذ احمد الجبوری اور اعلیٰ تعلیم کے وزیر ڈاکٹر حسین الشاوی تھے، موخر الذکر وزیر حال ہی میں ہندوستان کے دورے سے واپس آئے تھے، گفتگو کا موضوع تھا: "ایک عرب اسلامی ملک کے لئے صحیح تعلیمی پالیسی کیا ہے؟" مثلاً عراق میں جو اسلام کی دعوت واشاعت کا مرکز رہا ہے، اور جسے پورے عالم اسلامی میں علمی وفکری قیادت کا مقام حاصل تھا، دونوں کی گفتگو محتاط اور شائستہ تھی گفتگو میں نادانستہ طور پر چند لفظ ایسے بھی ٹپک پڑے تھے، جو اس قوم کی شخصیت اور اس عظیم علمی اور مذہبی ملک کے تابناک ماضی کے شعور کی غمازی کرتے تھے، احساسات وجذبات کو دبانے، ماضی کے اثرات کو ختم کرنے اور زندگی کے ٹھوس حقائق کو نظر انداز کرنے کی کوئی کوشش آج تک پورے طور پر کامیاب نہیں ہوسکی یہاں تک کہ روس میں بھی اس طرح کی کوششیں بارآور نہیں ہوئیں، اس لئے کہ یہ فطرت سے نبرد آزمائی اور حقائق سے انکار ہے۔

دیوان الاوقاف کے اعزازی جلسہ میں

دیوان الاوقاف نے جس کے قائم مقام صدر شیخ عبدالرزاق فیاض تھے (صدر ماسکو کے دورہ پر گئے ہوئے تھے) وفد کے اعزاز میں جامع الشہداء میں ایک عشائیہ دیا جس میں بغداد کے علماء، مساجد کے ائمہ اور واعظین ومشائخ کی خاصی تعداد شریک تھی، اہم شخصیتیں

---

[1] امام موسیٰ کاظم اور ان کے پوتے محمد التقی الجواد کا مدفن، یہ دونوں حضرات شیعہ کے نزدیک اثنا عشری ائمہ میں شمار ہوتے ہیں، یہ مقام "کاظمین" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

سابق مفتی عراق شیخ نجم الدین واعظ اور مدرسہ عبدالقادر جیلانی کے استاذ شیخ عبدالکریم موجود تھے، وقت کے بیشتر حصہ میں خاموشی چھائی رہی، اگر کسی نے کچھ کہا تو بس بقدر ضرورت، مگر ان کی خاموشی گفتگو سے زیادہ بلیغ اور صورت حال کی عکاس تھی، ان کے روشن چہروں کی لکیریں اور ان کی ذہین آنکھوں کی چمک جیسے کہہ رہی ہو "اگر یہ پہرہ دار موجود نہ ہوتے جو ہماری سانسوں کو گنتے اور ہمارے الفاظ کو ریکارڈ کرتے ہیں، تو آپ کے ساتھ ہمارا رویہ کچھ اور ہوتا، گویا زبان حال کہتی تھی:

گفتگو آئین درویشی نبود
ورنہ با تو ماجرا ہا داشتیم

کچھ آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اور کچھ سینوں میں الفاظ کا ہیجان نظر آیا، زبان حال سے سب متنبی کا شعر پڑھ رہے تھے:

الحزن یقلق والتجمل یردع
والدمع بینهما عصیّ طیّع

ترجمہ:- غم قلق انگیز ہے اور صبر و وقار عناں گیر، اور آنسو ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہیں۔

یک حرف کاشکے ست کہ صد جا نوشتہ ایم

رمادی عراق کا ایک علمی اور دینی مرکز ہے، وہاں کے علماء کا ایک وفد ہماری ملاقات کے لئے آیا، اور رمادی آنے کی دعوت دی تاکہ وہاں وہ اپنے اسلامی جذبات اور دینی احساسات کا بے تکلف اظہار کر سکیں اور ہمیں ان کی علمی و دینی سرگرمیوں سے واقفیت ہو نیز اس شہر کی

زیارت کی سعادت بھی حاصل ہو جو بہت سے علماء و مشائخ کا مرکز رہا ہے، ہم نے ان کے اس پاکیزہ اور نیک جذبہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا ہمارے لئے کوئی مانع نہیں ہے، بشرطیکہ وزارت خارجہ کی منظوری حاصل کر لی جائے جس نے ہمارا پروگرام مرتب کیا ہے۔ اندازہ ہوا کہ انھیں اپنے شہر میں ہم سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا شدید اشتیاق تھا چنانچہ انھوں نے وزارت سے رابطہ قائم کیا اور درخواست کی کہ ان کو اپنے شہر میں اپنے علمی اور دینی بھائیوں اور رابطہ عالم اسلامی کے وفد کو ـــــ جس کے دورہ کی نوبت ایک طویل وقفہ کے بعد آئی ہے ـــــ دعوت دینے کا موقع دیا جائے، اپنی اس خواہش اور جذبہ کے جواز کے لئے اور سند کے طور پر انھوں نے ایک نظیر بھی پیش کی کہ جب ضیاء الدین بابا خانوف جو روس کے جلیل القدر علماء میں شمار ہوتے ہیں، عراق کے دورہ پر تشریف لائے تھے تو ان کو دعوت دی گئی تھی اور حکومت نے اس کی اجازت بھی دے دی تھی، گویا اس طرح وہ رابطہ کے وفد کو دعوت دینے کے سلسلہ میں اپنے موقف کے لئے دلیل پیش کر رہے تھے اور ان ذمہ داروں کے لئے دلوں کو نرم کرنا چاہتے تھے جنھوں نے باہر کے ایک عالم کو دعوت دینے کی اجازت دیدی تھی، اس مثال سے بہت سے مضمرات کی جانب ہماری رہنمائی ہوئی، اور جس عجیب صورت حال سے ملک دوچار ہے، اس کو سمجھنے میں بہت مدد ملی جو کسی کتاب یا بلیغ ترین عبارت سے سمجھ میں نہیں آسکتی تھی، بعد میں معلوم ہوا کہ رمادی کے لوگ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے، اور وزارت خارجہ نے ان کی درخواست منظور نہیں کی۔

ہم نے نجف کی زیارت کی خواہش ظاہر کی جو عراق بلکہ شیعی دنیا کا ایک اہم علمی و تعلیمی مرکز ہے جہاں ہزاروں طلبہ جن کی بڑی تعداد ہندوستانی ہے، رہتے ہیں، اسی طرح کربلا اور کوفہ جانے کی بھی درخواست کی مگر جواب میں کہا گیا، اندیشہ ہے کہ صدر جمہوریہ ملاقات کے لئے

طلب کریں اور آپ حضرات اس وقت شہر میں موجود نہ ہوں، جب بھی بغداد سے باہر کسی جگہ جانے کی درخواست کی جاتی یہی جواب ملتا اور یہی عذر پیش کیا جاتا، البتہ سلمان پاک[1] اور مدائن کے تاریخی مقامات دیکھنے کا موقع ملا جو بغداد سے ۳۰ کیلو میٹر دور جنوب میں دجلہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہیں، اگرچہ یہ دورہ بھی سرسری رہا۔

شیعہ علماء کی ایک جماعت نے ہوٹل میں وفد سے ملاقات کی اور کچھ دیر تک ساتھ بیٹھے رہے، ہمارے دائیں اور بائیں "کراماً کاتبین" مسلط تھے، ان علماء نے نجف اور کربلاء کی زیارت کا شوق دلایا، اور اس دورہ کی ضرورت اور علمی و دینی قدر و قیمت کا بھی ذکر کیا، نیز کہا وہاں کے علماء ہماری ملاقات کے مشتاق ہیں، ہم نے وہاں جانے اور وہاں کے علماء کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لئے کلی آمادگی ظاہر کی لیکن ہم نے کہا کہ ہم اس ملک میں گھومنے پھرنے میں آزاد نہیں ہیں، اور بغداد سے باہر جانے کے سلسلہ میں وزارت کا عذر یہ ہے کہ ممکن ہے، عزت مآب صدر اپنی ملاقات سے مشرف کرنے کے لئے ہم کو طلب کریں اور اس وقت ہم بغداد میں موجود نہ ہوں جس کے نتیجہ میں اس ملاقات کی سعادت سے محروم ہو جائیں۔

بغداد یونیورسٹی، المجمع العلمی العراقی اور المجمع العلمی الکردی میں

اس مختصر قیام کے دوران بغداد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سعد الراوی سے ملاقات ہوئی، یونیورسٹی کے مقاصد اور تعلیم کا موضوع زیر بحث رہا، ڈاکٹر صاحب بغداد یونیورسٹی کی ابتداء اس کی توسیع اور اس کے مختلف شعبوں پر گفتگو کرتے رہے، یہ ہمارے سرکاری پروگرام کی مقرر کردہ آخری ملاقات تھی۔

---

[1] وہ مقام جہاں حضرت سلمان فارسیؓ مدفون ہیں، انھیں کے قریب ذرا فاصلہ سے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا مرقد ہے۔

علمی اورادبی ذوق نے ہم کو مجبور کیا کہ المجمع العلمی العراقی (عراق اکیڈمی) اور
المجمع العلمی الکردی (کرد اکیڈمی) دیکھنے جائیں، جن کی علمی اور تحقیقی کوششوں کی ہم قدر کرتے
ہیں، المجمع العلمی العراقی میں محقق عالم ڈاکٹر ناجی معروف جن کی تحقیقات، بلند پایہ علمی مضامین و
تصنیفات سے استفادہ کا موقع بھی ہم کو ملا تھا، مجمع کے صدر عبدالرزاق محی الدین، استاذ
یوسف عزالدین اس کے جنرل سکریٹری فاضل طائی اور ہمارے پرانے دوست اور عراق کے
اسلامی شاعر ولید الاعظمی نے ہمارا استقبال کیا، صدر مجمع اور ڈاکٹر ناجی معروف نے
المجمع العلمی الکردی بھی دیکھنے کی فرمائش کی، دونوں اکیڈمیوں نے اپنی بعض مطبوعات ہم کو
بطور ہدیہ پیش کیں۔

نئے تجربے

شارع متنبی پر واقع ایک بڑے مکتبہ میں گئے اور اپنی بعض تصنیفات تلاش کیں
مگر ایک تصنیف بھی نہ ملی، یہ مکتبہ ان اسلامی کتابوں سے خالی نظر آیا، جو اسلام کی سربلندی
کا پیام دیتی ہیں، ہم کو معلوم ہوا کہ اکثر وہ کتابیں یہاں ممنوع ہیں جو اس ملک میں اسلام کی
نشأۃ ثانیہ اور احیاء کی دعوت دیتی ہیں، اور جن میں موجودہ حالات پر تنقید ہے، اس شہر
میں جو مشرق عربی کا اہم ثقافتی مرکز ہے، اور جس پر ایک ترقی پسند پارٹی حکمراں ہے جو فکر و خیال
اور عقیدہ و ضمیر کی آزادی کی قائل ہے، یہ بات بڑی تعجب انگیز ہے۔

سعودی سفارتخانہ نے وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا، جس میں صرف سفارتخانہ
کا عملہ اور وہ حضرات شریک تھے، جو ہماری رفاقت کے لئے مقرر کئے گئے تھے یہی لوگ
وزارت خارجہ اور عراقی حکومت کی نمائندگی کر رہے تھے، علماء دین میں سے کوئی شخص وفد کے ارکان

اور اپنے دینی و علمی بھائیوں سے ملاقات کے اشتیاق کے باوجود شریک نہ ہو سکا۔

عراقی میوزیم ــــ تأثرات

۱۰ راگست ۱۹۷۳ء جمعہ کے روز عراقی میوزیم دیکھنے گئے، ہماری رہنمائی کے لئے اس کے فاضل ڈائرکٹر موجود تھے، جو آثار قدیمہ کے ماہر ہیں، عراق کی تہذیب، تاریخ، معاشرہ اور حکومتیں ہزار سال قبل مسیح سے آج تک جن ادوار و مراحل سے گزری ہیں ان کا مشاہدہ کرایا، مثلاً بابلی دور، کشی دور، سلوقی دور، فرثی دور وغیرہ، ہماری توجہ کا مرکز اسلامی عہد اور اسلامی آثار رہے اگرچہ اسلامی آثار بہت کم ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ہم کوئی تاریخی فلم دیکھ رہے ہوں جس میں ایک حکمراں آتا ہے، دوسرا جاتا ہے، ایک حکومت برسر اقتدار آتی ہے، دوسری زوال پذیر، ایک شہر آباد ہوتا ہے، دوسرا برباد، بلند اور پرشکوہ عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں، اور چشم زدن میں ویرانوں اور کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، یہ ساری چیزیں اس طرح گزر رہی تھیں، جیسے تاریخ کوئی ہزلیہ ڈراما (COMEDY) ہو جس میں حقیقت و واقعیت نام کو نہ ہو، جیسے بچوں کا ڈراما ہو جس میں کوئی بادشاہ کا کردار ادا کر رہا ہو کوئی وزیر کا، کوئی طاقتور کا، کوئی کمزور کا جیسے علی بابا یا الف لیلہ کے بغداد کے تاجر کا قصہ ہو، اور قصہ کے ماہر فن کار نے جس شخص کے حوالہ جو کردار کیا ہے، وہ ادا کر رہا ہے، کوئی کردار اس کے حکم سے انحراف نہیں کرتا سب کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے، سب اس کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں، اور ہر شخص بھول جاتا ہے کہ وہ اپنے فعل میں مختار اور آزاد نہیں ہے، بلکہ مجبور اور پابند ہے، پھر آرزوؤں اور تمناؤں میں کھو جاتا، اور اپنے خیالی جزیروں میں گم ہو جاتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ یہی کردار

اداکرتا رہے گا، اور اس کی طاقت وقوت اور حکومت وسلطنت کبھی زوال پذیر نہیں ہوسکتی۔

ان تاریخی معلومات اور ماہ وسال کی تیز رفتار تبدیلیوں سے میرا جی اُوب گیا اور قوت وطاقت اور حکومت و دولت پر سے خواہ کتنی ہی وسیع، ہمہ گیر اور دیرپا نظر آئے میرا یقین؟ اعتماد جاتا رہا۔

ماضی کے کچھ نقوش اور یادیں

ہم نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مرقد کی زیارت کی اور شیخ کی مسجد میں ایک سے زیادہ مرتبہ نماز ادا کی شیخ کا شمار امت اسلامیہ کے ان چند شخصیات میں ہوتا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے قبول عام اور بقار دوام بخشا، ایسی شہرت ومقبولیت شاذونادر ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے، میری نگاہوں کے سامنے شیخ کے وہ عظیم الشان کارنامے[1] پھرنے لگے[2] جو اسلام کی تبلیغ واشاعت، معاصی کی روک تھام نفوس کے تزکیہ، طاغوت شکنی اور خدا ہی سے امید وبیم کا رشتہ استوار کرنے کی شکل میں ظاہر ہوئے، میں سوچنے لگا، شیخ کی مجالس حاضرین وسامعین سے کیسے کھچا کھچ بھری رہتی تھیں، یہود ونصاریٰ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام

---

[1] میں نے اپنی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ اول میں شیخ کے حالات اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

[2] لیکن بڑی ستم ظریفی ہے کہ جاہلوں نے آپ کی دین خالص اور صرف اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کی دعوت اور سنت محضہ کی مداومت سے کوئی سبق نہیں لیا اور آپ کی تعظیم میں ایسے طریقے اختیار کرنے لگے جو توحید اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں، مثلاً سجدہ کرتے ہیں، قبر کا بوسہ لیتے اور طواف کرتے ہیں، ہم کو ان غیر اسلامی مناظر سے سخت تکلیف ہوئی، ہم نے بعض ذمہ داروں کو توجہ دلائی کہ جاہلوں کو ان منکرات کے ارتکاب کا موقع نہ دیں، ہمارا خیال ہے کہ اگر وزارت اوقاف یا نقابت الاشراف اس کا عزم کرے تو کوئی مشکل کام نہیں ہے

ہوتے تھے، قاتل، رہزن اور عیار و شاطر افراد توبہ کرتے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے تھے، کس طرح دلوں میں نرمی، جھکاؤ اور خشوع و انابت کی کیفیات پیدا ہوتی تھیں، پتھر موم اور دشمن دوست بن جاتے تھے۔

شیخ اگر اس وقت ہوتے

شیخ کا دور عباسی خلافت کے عروج کا دور تھا، اسلام کا بول بالا تھا، ساری دنیا مسلمانوں کے زیر نگیں تھی، لیکن اس کے باوجود شیخ بغداد اور عالم اسلام کی صورتحال سے مطمئن نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ اسلام میں ضعف اور مسلمانوں میں نفاق سرایت کر گیا ہے، اسلامی معاشرہ انھیں امراض میں مبتلا ہو گیا ہے، جو گزشتہ قوموں اور حکومتوں کی تباہی اور زوال کا سبب بنے یعنی مادہ پرستی، بوالہوسی، حب جاہ، خود غرضی، غیر اللہ کی غلامی، فضائل اخلاق اور اصل دین سے بے پروائی اور غفلت، بادشاہوں اور امراء کی خوشامد وغیرہ۔

میں نے اپنے دل میں کہا، شیخ اگر اس وقت تشریف رکھتے اور آج کا بغداد دیکھتے تو ان کے قلب حساس و درد مند پر کیا گزرتی، وہ ملاحظہ فرماتے کہ اہل زمانہ اور ابنائے وطن کس طرح بتان نو کے پجاری اور حب دنیا کے زناری بن چکے ہیں، اسلام کی بجائے دوسری شریعتوں، دنیاوی مذاہب اور خود ساختہ نظامہائے حیات سے رشتہ جوڑ لیا ہے، اور کس طرح انھوں نے باہر سے زندگی کے طور طریق حکومت کے انداز اور سیاسی و اقتصادی نظام درآمد کر لئے ہیں، شیخ جو عالی نسب ہاشمی خلیفہ کی بے راہ روی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور اس کے اخلاق و اعمال پر بے محابا تنقید فرماتے تھے، اس صورتحال کو کیسے گوارا کرتے کہ آج ایک عیسائی قائد[1] یا ملحد لیڈر جس کا اس ملک سے مذہب و نسب کا کوئی رشتہ نہیں ہے، ہارون رشید اور

[1] حکمران "البعث العربی" پارٹی کے بانی و رہنما میشل عفلق کی طرف اشارہ ہے، جو مذہباً عیسائی اور اصولاً قوم پرست اور اشتراکی ہیں

اس کے فرزندوں کے تخت پر جلوہ افروز ہے اور پشتینی مسلمانوں اور عربی النسل قوموں کو اپنے ڈنڈے سے اس طرح ہانک رہا ہے، جیسے کوئی چرواہا بھیڑ بکریوں کے گلے کو ہانکتا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر شیخ کا درد و کرب

مجھے یاد آیا کہ چھٹی صدی ہجری میں جب بغداد دعوت و اصلاح اور علم و ثقافت کا مرکز اور اسلام ملک کا محور یا ہر ہر جگہ طاقتور ہو چکا تھا، شیخ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا،

"دین محمدی کی دیواریں منہدم ہو رہی ہیں، اسلام کی بنیاد کھوکھلی ہو رہی ہے آؤ اے اہل زمین آؤ، جو حصہ گر گیا ہے، اس کو اٹھا دیں اور مرتب کر دیں۔
اے آفتاب و ماہتاب اور اے لیل و نہار آؤ، لوگو! اسلام فریاد کر رہا ہے، مدد کے لئے پکار رہا ہے، ان فساق و فجار، گمراہ و بدعتی، ظالم اور فریب کار لوگوں نے اسلام کو دل گرفتہ کر دیا ہے۔"[1]

یہ درد مندی اور بے قراری اس زمانہ میں شیخ کو ہو رہی تھی، جو بڑی خیر و برکت کا زمانہ تھا تو آج اگر شیخ موجود ہوتے تو ان کی بے قراری کا کیا عالم ہوتا جب دیکھتے کہ مسلمان خود اسلام پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں، مذہب کو کارگہ حیات سے بے دخل اور بے تعلق کر دیا ہے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مسلمانوں کو جو صحیح علم حکیمانہ اور عادلانہ دستور زندگی اور انھیں کی زبان میں جو معجز کتاب عطا ہوئی تھی اور آپ کی نبوت و قیادت کے سائے میں انھیں جس شرف و سربلندی اور جس سرخروئی و ہردلعزیزی سے نوازا گیا تھا، اس کی انھوں نے کوئی قدر نہ کی اور اس کو چھوڑ کر دوسرے مذاہب و ادیان اور دوسرے فلسفوں اور نظام ہائے حیات

---

[1] الفتح الربانی ص ۶۶

سے رشتہ جوڑلیا، ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمان یہاں سے آدھی دنیا پر حکومت کرتے تھے، دنیا و آخرت دونوں کی سعادتوں سے بہرہ اندوز ہوتے تھے، اور اجسام و قلوب سب پر ان کی حکمرانی تھی لیکن جب مسلمانوں نے اسلام کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا، تو ذلت و خواری اور ہلاکت و ادبار کے غار میں جاگرے۔

عراق انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد

ہم روزانہ شہر جاتے شارع رشید سے گزرتے جو ہمارے ہوٹل سے قریب ترین سڑک تھی، رصافہ اور کرخ[1] کے درمیان چہل قدمی کرتے اور ان مقامات سے وابستہ اشعار و واقعات یاد کرتے، اس جسر (پل) سے گزرتے جو ان دونوں علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے، اور وہ غزلیہ اشعار یاد کرتے جو اس جسر (پل) کے بارے میں کہے گئے ہیں، بعد میں متعدد نئے پل بھی تعمیر کئے گئے ہیں، جن کے ذریعہ دجلہ کو پار کرتے ہیں۔

اس سے پہلے ۱۹۵۶ء میں بغداد آنا ہوا تھا جب شاہ فیصل بن غازی کی حکومت تھی اور نوری السعید پاشا وزیر اعظم تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ کوئی مثالی دور نہیں تھا، اور نہ حکومت اسلامی نظام کے مطابق تھی، حکومت کی پالیسی، ذمہ داروں کی مطلق العنانی اور اس وقت کے حالات پر شدید نکتہ چینی کی گنجائش ہے، عوام اور حکومت کے درمیان ایک خلیج حائل تھی، ظلم و استبداد تھا، بدعنوانی اور مطلق العنانی تھی، عراقی حکومت برطانوی سیاست کے چشم و ابرو پہ گھوم رہی تھی، یقیناً یہ صورتحال غلط اور قابل تنقید تھی، اگر حکام کا رویہ درست ہوتا اور اسلامی شریعت اور اس کے منصفانہ اصولوں پر عمل کیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ ملک اس سے زیادہ مضبوط،

---

[1] بغداد کا مغربی محلہ کرخ کے نام سے مشہور ہے جس کے بارے میں ابوالعلاء معری کہتا ہے ؎

(باقی صفحہ پر)

مستحکم اور خوشحال ہوتا۔

لیکن جب میں بغداد کی سڑکوں پر ٹہلتا تھا، لوگوں کی باتوں کو سنتا اور ان کے چہروں کو پڑھتا نیز اپنے اس دورے کے بعض مخصوص تجربات کی روشنی میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عبدالکریم قاسم کے انقلاب سے پہلے ملک زیادہ خوشحال اور مستحکم تھا، قوم میں آج سے زیادہ آزادی، بے فکری اور اعتماد تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں بغداد آیا تھا، تو کسی طرح کے دباؤ، پابندی اور پہرہ کا احساس نہیں ہوا تھا، میں پوری آزادی سے بغداد اور بیرون بغداد گھومتا پھرتا تھا، جس سے چاہتا میں ملاقات کرتا اور جو چاہتا مجھ سے ملاقات کرتا اور کسی طرح کی بازپرس کا

(باقی ص ۲۰۰ کا) فیا برق لیس الکرخ داری وانما رمانی إلیہ الدھر منذ لیالی

فھل فیک من ماء المعرة قطرة تغیث بہا ظمآن لیس بسالی

ترجمہ:۔ اے برق! کرخ میرا وطن نہیں ہے، گردشِ ایام نے کچھ دنوں سے یہاں لاکر چھوڑ دیا، کیا تیرے پاس معرہ کے پانی کی کوئی بوند نہیں ہے؟ جس سے تو ایک تشنہ لب کی پیاس بجھا سکے؟

کرخ بغداد کا قدیم محلہ ہے، مشرقی علاقہ رصافہ کے نام سے مشہور ہے، یہ نام ہارون رشید نے رکھا تھا، اور اس میں ایک محل بھی تعمیر کیا تھا، رصافہ کے بارے میں ابن الجہم کہتا ہے:

عیون المہا بین الرصافة والجسر جلبن الھوی من حیث أدری ولا أدری

اثرن لی الشوق القدیم ولم اکن سلوت ولکن زدن جمرا علی جمر

ترجمہ:۔ فراخ چشم حسینوں نے جو رصافہ اور جسر کے درمیان خوشخرامی میں مصروف تھیں، مجھے معلوم و نامعلوم طریقہ پر اپنی محبت کا اسیر بنا لیا۔

انھوں نے میرے قدیم شوق میں جو ابھی افسردہ نہیں ہوا تھا، ایک نئی تحریک پیدا کر دی اور اس شرارۂ محبت کو ہوا دیکر اور فروزاں کر دیا۔

اندیشہ نہ ہوتا۔ "جمعیۃ انقاذ فلسطین" کے مرکز میں میری ایک تقریر ہوئی تھی جو بعد میں "أزمۃ ایمان واخلاق" (ایمان واخلاق کا بحران) کے نام سے شائع ہوئی، اس تقریر میں نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، میں نے پوری آزادی سے تقریر کی تھی، عراق اور عالم اسلامی کے اخلاقی انحطاط، موجودہ معاشرہ کے ایمانی اور اخلاقی بحران، باضمیر وبااصول افراد کے فقدان جیسے موضوع پر میں نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا، مگر سیاسی حلقوں میں اس تقریر سے کوئی کھلبلی نہیں مچی اور مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور بغداد سے اسی طرح آزاد و بے فکر اور سرور ومطمئن آیا تھا جس طرح بغداد میں داخل ہوا تھا۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ نفع ونقصان، سود وزیاں اور کامیابی وناکامی کے درمیان موازنہ کرتا ہے۔

تو آخر ان ملکوں کو ان ہولناک انقلابات سے کیا ملا جو حالات کو سدھارنے، قوم کو ظلم واستبداد کے آہنی پنجہ سے آزاد کرنے اور اس کی اس فطری حریت کو بحال کرنے کے لئے رونما ہوئے تھے۔

یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ہم ان تمام لوگوں سے چاہتے ہیں، جو حقیقت پسند اور حق شناس ہیں اور جو عرب اسلامی ملکوں کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

جامع الشہداء میں خطاب

نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے دیوان الاوقاف نے ہمارے لئے جامع الشہداء کا تعین کیا تھا، جو بغداد سے کئی کیلومیٹر دور ہے، اور اس شدید گرمی میں دوپہر کے وقت وہاں پہنچنے میں لوگوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے، معلوم نہیں کیسے ہماری آمد کی خبر علماء اور مسلم نوجوانوں تک

پہنچ گئی، جو اپنے دینی بھائیوں سے ملاقات کرنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق تھے، چنانچہ مسجد نمازیوں سے بھر گئی، مجھ سے متعدد آدمیوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں نماز بعد تقریر کروں، میں نے ہر چند معذرت کی مگر بے سود آخر کار میں نے معاملہ ذمہ داروں پر ڈال دیا، مجھے اندیشہ ہوا کہ خدانخواستہ کوئی ناخوشگوار بات پیش آجائے اور اس کا اثر ان دوستوں پر پڑے جنھوں نے تقریر کی خواہش کی تھی اور اسی لئے جامع مسجد میں تشریف لائے تھے، ذمہ داروں نے منظوری دے دی۔

میں سوچنے لگا کہ میری آج کی تقریر کا موضوع کیا ہو، مجھے محسوس ہوا کہ گفتگو کا دائرہ تنگ اور موقع نازک ہے، ایسے وقت میں قرآن نے میری دستگیری کی اور قرآن ہمیشہ ہی متحیر اور پریشان آدمی کی دستگیری... اور .... رہنمائی کرتا ہے، اسے خدا کا الہام اور اس کی توفیق کہیے کہ استاذ عبدالرزاق فیاض نے اپنی شیریں اور گونجنے والی آواز میں نماز سے پہلے سورہ انبیاء کی تلاوت کی تھی، میں نے اسی سورہ کی ایک آیت "لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ" کو لے لیا، اور اس آیت کریمہ نے گفتگو کا ایک وسیع میدان میرے سامنے کر دیا، ایسی گفتگو جو دلوں کو چھوتی تھی، زندگی سے جس کا گہرا تعلق تھا اور جو صورت حال پر منطبق بھی ہوتی تھی، میں نے کہا:

قرآن ایک صاف شفاف آئینہ ہے جس میں افراد اور قومیں اپنا چہرہ دیکھتی اور اپنا مقام پہچانتی ہیں

"حضرات!

میں نے ایک عزیز دوست سے سورۃ الانبیا کی تلاوت سنی تو اسکی ایک عبرت آموز

آیت نے میرے ذہن میں بے شمار معانی کے دریچے کھول دیئے۔ ارشاد باری ہے

لَقَدْ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ	ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب
ذِكْرُكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ٥	نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے
(الانبیاء ـــ ۱۰)	تو تم غور کیوں نہیں کرتے ؟

یہ آیت ہمیں... بتاتی ہے کہ قرآن ایک صاف شفاف سچا، وفادار و دیانت دار آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنے خدو خال دیکھ سکتا ہے، معاشرہ میں اپنا مقام پہچان سکتا ہے اور خدا کے نزدیک اپنا مرتبہ معلوم کر سکتا ہے کیونکہ قرآن انسانوں کے اخلاق وصفات بیان کرتا ہے، اور اس میں انسانیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کے نمونہ کی تصویریں موجود ہیں۔ "فِيْهِ ذِكْرُكُمْ" یعنی اس کتاب میں تمہارا بیان ہے، تمہارے حالات واوصاف مذکور ہیں، جیسا کہ بہت سے علماء نے سمجھا ہے، سلف قرآن کو ایک زندہ، بولنے والی اور زندگی سے لبریز کتاب تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک قرآن کوئی تاریخی اور آثار قدیمہ کی چیز نہیں تھی جو صرف ماضی اور اگلے وقتوں کے لوگوں سے بحث کرتی ہو اور جس کا زندہ لوگوں سے بدلتی ہوئی انسانی زندگی اور انسانیت کے ان بے شمار و لامحدود نمونوں سے جو ہر زمان و مکان میں موجود رہتے ہیں کوئی تعلق نہ ہو۔

ہمارے اسلاف اپنے اخلاق واوصاف اور اپنے اندرون کو بخوبی جانتے تھے ہر چیز ان کے سامنے روشن اور عیاں ہوتی تھی، وہ اسی قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، اسی عجیب وغریب کتاب میں اپنے چہرے ڈھونڈتے اور اپنے اخلاق و اطوار کی سچی اور صحیح تصویر تلاش کرتے تھے، اور بہت آسانی سے خود کو اس کتاب میں

پا جاتے تھے، اور پہچان لیتے تھے اگر ذکر خیر ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور کچھ اور ہوتا تو استغفار کرتے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔

اس آیت کی تلاوت پر مجھے سیدنا احنف بن قیس کا ایک واقعہ یاد آیا حضرت احنف بن قیس کبار تابعین میں سے ہیں، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مخصوص ترین اصحاب میں ان کا شمار ہے، حلم میں ضرب المثل تھے، مگر اس کے باوجود جب غصہ ہو جاتے تو ان کی غیرت و حمیت میں جوش آجاتا، لوگ کہتے تھے کہ جب احنف کو غصہ آتا ہے تو ان کے ساتھ ایک لاکھ تلواریں غضبناک ہو جاتی ہیں، یہ واقعہ میں نے ابوعبداللہ محمد بن النصر المروزی (متوفی ۲۷۵ھ) کی تصنیف "قیام اللیل" میں پڑھا ہے، مصنف امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور گمان غالب ہے کہ اس کتاب کی تالیف آپ ہی کے شہر بغداد میں ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت احنف بن قیس تشریف فرما تھے کہ انھوں نے کسی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو چونک پڑے اور فرمایا، ذرا قرآن مجید لانا میں اپنا ذکر تلاش کروں، اور معلوم کروں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کس سے مشابہ ہوں۔

قرآن مجید کھولا تو اس آیت پر نظر پڑی جس میں کچھ لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:-

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ	رات کے تھوڑے سے حصے میں سوتے
مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ	تھے، اور اوقات سحر میں بخشش مانگا

یَسْتَغْفِرُوْنَ ○ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ	کرتے تھے، اور ان کے مال میں مانگنے
حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○	والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا
(الذّاریات ـ ۱۷ ـ ۱۹)	حق ہوتا تھا۔

پھر یہ آیت گزری:۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے
یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ	ہیں، (اور) وہ اپنے پروردگار کو
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ○	خوف وامید سے پکارتے ہیں اور جو
(السجدہ ـ ۱۶)	مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

پھر ان کے سامنے ایک گروہ آیا جس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ	اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ
سُجَّدًا وَّقِیَامًا ○	کر کے عجز وادب سے کھڑے رہ کر راتیں
(الفرقان ـ ۶۴)	بسر کرتے ہیں۔

پھر ان کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ	جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا
وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ	کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، اور
الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ	غصہ کو روکتے ہیں، اور لوگوں کے
وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○	قصور معاف کرتے ہیں اور خدا
(آل عمران ـ ۱۳۴)	نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔

پھر ان کے سامنے کچھ نمونے آئے جن کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ	اور دوسروں کو اپنی جانوں سے مقدم
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج
وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ	ہی ہو، اور جو شخص حرص نفس سے
فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ۝	بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے
(الحشر-۹)	والے ہیں۔

پھر یہ آیت سامنے آئی:-

وَٱلَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَٰٓئِرَ ٱلْإِثْمِ	اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی
وَٱلْفَوَٰحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا۟ هُمْ	کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور
يَغْفِرُونَ ۝ وَٱلَّذِينَ ٱسْتَجَابُوا۟	جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے
لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَ	ہیں، اور جو اپنے پروردگار کا فرمان
أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا	قبول کرتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں، اور
رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ۝	اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے
(الشوریٰ - ۳۷-۳۸)	ہیں، اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا
	ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

پھر رک گئے اور فرمایا: اے اللہ میاں تو میں اپنے آپ کو نہیں پا رہا ہوں اور دوسری جگہ تلاش کرنا شروع کیا تو ایک جماعت کا تذکرہ دیکھا:

إِنَّهُمْ كَانُوٓا۟ إِذَا قِيلَ لَهُمْ	ان کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کہا جاتا
لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝	تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ۝ (الصّٰفّٰت - ۳۵-۳۶)

غرور کرتے تھے اور کہتے تھے بھلا ہم ایک دیوانہ شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔

پھر ان کا ذکر گزرا:

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ (الزمر - ۴۵)

اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے، تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے، خوش ہو جاتے ہیں۔

پھر ان حضرات کا تذکرہ سامنے آیا جن سے سوال کیا جائے گا:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۝ (المدثر - ۴۲-۴۷)

(سوال ہوگا) تم دوزخ میں کیوں پڑے، وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے، اور اہل باطل کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی۔

پھر ٹھہر گئے اور فرمایا، اے اللہ میں تیری بارگاہ میں ان لوگوں سے برات ظاہر کرتا ہوں، اس کے بعد ورق الٹتے رہے، اور تلاش کرتے رہے، آخر کار جب اس آیت پر نظر پڑی

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ	اور کچھ اور لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا
خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا	اقرار کرتے ہیں، انھوں نے اچھے اور
عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ	برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا قریب
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○	ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے
(التوبہ ــ ۱۰۲)	بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔[1]

تو فرمانے لگے: "خداوندا! میں انھیں لوگوں میں سے ہوں۔"[2]

آئیے ہم بھی اپنا ذکر اور اپنی تصویر پوری دیانت داری اور سنجیدگی سے قرآن میں تلاش کریں۔ قرآن بشیر بھی ہے اور نذیر بھی، صالحین کے ساتھ کفار و مشرکین کا بھی تذکرہ اس میں موجود ہے، قرآن افراد اور جماعتوں دونوں کی تصویر کشی کرتا ہے ارشاد ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ	اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو
قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ	دنیا کی زندگی میں تم کو دل کش معلوم
اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ	ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر
اَلَدُّ الْخِصَامِ ○ وَاِذَا تَوَلّٰى	خدا کو گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ
سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا	سخت جھگڑالو ہے، اور جب پیٹھ پھیر کر
وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ	چلا جاتا ہے[3] تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے

---

[1] آیات کا ترجمہ مولانا فتح محمد صاحب کے ترجمۂ قرآن سے برائے نام فرق کے ساتھ منقول ہے۔

[2] کتاب قیام اللیل طبع ملتان ۱۳۲۰ھ صفحہ ۱۳۔

[3] بعض لوگوں نے "تولّٰی" کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ "جب اس کو حکومت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے"

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝
وَإِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ
أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ
فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ
الْمِهَادُ ۝
(البقرۃ۔۲۰۴۔۲۰۶)

تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے اور
کھیتی کو (برباد) اور انسانوں
اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کردے
اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا
اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا
سے خوف کرو، تو غرور اس کو گناہ
میں پھنسا دیتا ہے، سو ایسے کو جہنم
سزاوار ہے، اور وہ بہت برا
ٹھکانہ ہے۔

پھر اس کے بعد ارشاد ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ
نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ
(البقرہ۔۲۰۷)

اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی
خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی
جان بیچ ڈالتا ہے اور خدا بندوں
پر بہت مہربان ہے۔

ایک جماعت کا ذکر اس طرح ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ
مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ
بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهُ أَذِلَّةٍ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ

اے ایمان والو اگر کوئی تم میں سے اپنے
دین سے پھر جائیگا، تو خدا ایسے لوگ
پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے
اور جسے وہ دوست رکھیں، اور جو

يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (المائدہ ـ ۵۴)	مومنوں کے حق میں نرمی کریں، اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں، اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور خدا بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔

ایک دوسری جماعت کا تذکرہ اس طرح ہے :۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا (الاحزاب ـ ۲۳)	مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں، جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا، اس کو سچ کر دکھایا، تو ان میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے۔ اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں، اور انھوں نے (اپنے قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔

شکر اور احسان شناسی کی ترغیب دلاتے ہوئے قرآن انبیا اور ان کے متبعین کا ذکر کرتا ہے، اور ناشکری، احسان فراموشی، غرور اور حسن سلوک کا جواب بدسلوکی سے دینے کی مذمت کرتے ہوئے، اور اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے :۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا
نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا	جنھوں نے خدا کے احسان کو ناشکری
قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝	سے بدل دیا، اور اپنی قوم کو تباہی کے
(ابراہیم ـ ۲۸)	گھر میں اتارا۔

اور اس کی مثال ایک بستی سے دیتا ہے جس نے خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیا۔ اور جس کے افراد اپنی خوشحالی پر اترانے لگے، ارشاد ہوتا ہے :۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً	اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا
كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا	ہے کہ (ہر طرح) امن چین سے بستی
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ	تھی ہر طرف سے رزق بافراغت
فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا	چلا آتا تھا، مگر ان لوگوں نے خدا کی
اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ	نعمتوں کی ناشکری کی تو خدا نے
بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝	ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک
(النحل ـ ۱۱۲)	اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری
	کا) مزہ چکھا دیا۔

یہ انسانی اور اخلاقی نمونے جو قرآن نے مختلف ناموں سے پیش کیے ہیں کہیں کسی مطلق العنان فرمانروا کے نام سے مثلاً فرعون کہیں کسی سرکش وزیر یا امیر کے نام سے مثلاً ہامان، کہیں کسی متکبر اور بخیل سرمایہ دار کے نام سے مثلاً قارون، کہیں کسی ظالم و جابر قوم کے نام سے مثلاً عاد کہیں کسی مشہور اور ماہر صنعت قوم کے نام سے مثلاً ثمود یہ تمام لازوال انسانی نمونے ہیں جو کسی

زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، اور یہ تمام نمونے انسانی فطرت کے مختلف کمزور پہلوؤں اور گوشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے ان افراد اور جماعتوں کے انجام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور صفائی کے ساتھ کہا ہے کہ جو بھی ان کے نقش قدم پر چلے گا اور ان کو اپنا رہنما اور قائد تسلیم کرے گا، اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان افراد اور جماعتوں کا ہوا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ — جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں ان میں بھی خدا کا یہی
وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا — دستور رہا ہے، اور خدا کا حکم مقرر ہو چکا ہے
(الاحزاب۔ ۳۸)

تقریر ختم ہونے کے بعد حاضرین مصافحہ و معانقہ کے لئے پل پڑے اور ایک نے میرے کان میں چپکے سے کہا: "ہجوم دس گنا ہوتا اور پورا بغداد امنڈ آتا، اگر حالات معمول پر ہوتے اور لوگوں کو آزادی حاصل ہوتی"

بصرہ نہ دیکھنے کا افسوس

ہم نے بصرہ جانے کی درخواست کی جو قدیم تاریخ میں علم، زہد اور دعوت اسلامی کا اہم مرکز، اموی دور میں دمشق کے بعد سب سے بڑا شہر اور سید التابعین حسن بصری کا وطن رہا ہے لیکن وہی پرانا جواب ملا کہ "ہو سکتا ہے، صدر جمہوریہ آپ کو طلب کریں اور آپ لوگ نہ ملیں"، کویت جاتے وقت ارادہ تھا کہ بصرہ میں رک کر وہاں سے عمان جائیں گے مگر موقع نہ مل سکا

بغداد سے روانگی

اتوار کی شام کو بغداد سے روانہ ہوئے، دل میں اس کی یاد اور اس کی محبت

چٹکی لے رہی تھی، اور زبان حال گویا تھی ؂

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

شہیدوں اور پاسبانوں کی سرزمین

اردن میں

ترجمہ

مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی

بغداد سے عمّان

چار عرب اسلامی ملکوں کے اس دورہ کی آخری منزل شرق اردن تھا، اور غالباً یہ اچھا ہی ہوا، کیونکہ اظہار خیال کی جتنی آزادی اور جتنا موقع وہاں حاصل ہوا وہ ان ملکوں میں قطعاً حاصل نہیں ہوا، جہاں کی حکومتیں جمہوریت و قومیت کی علمبردار ہیں، اور جو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ان پر کوئی ایک فرد یا کوئی مخصوص خاندان حکمرانی کرے، ان کے نزدیک یہ رجعت پرستی اور پسماندگی کی علامت ہے جس کی اس آزاد و ترقی یافتہ دور میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اتوار ۱۲ راگست ۷۳ء رات کو تقریباً ۹ بجے ہم بغداد سے روانہ ہوئے، ہم کو رخصت کرنے کے لئے سعودی سفیر اور بغداد کے بعض اساتذہ جو سعودی عرب میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، تشریف لائے تھے، بصرہ کے ہوائی اڈہ پر ایک گھنٹہ کے لئے اترے اس عظیم علمی اور تاریخی شہر کی زیارت کی اجازت نہیں مل سکی تھی، جو دین، علم اور ادب ونحو کا ایک مستقل مکتب فکر تھا، ہوائی اڈہ پر اچانک سعودی قونصل سے ملاقات ہوئی، انھوں نے

بہت اصرار کیا کہ ہم بصرہ میں ان کی میزبانی میں کچھ وقت گزاریں اور اس تاریخی شہر کی سیر کریں، اس غیر متوقع ملاقات سے ہم سب کو بہت مسرت ہوئی پھر کویت کے لئے طیارہ پر سوار ہو گئے، رات کویت میں گزاری، شیرٹن (SHERATON) ہوٹل میں قیام کیا، جہاں شیخ عبدالرزاق صالح، ہمارے دوست ڈاکٹر عبداللطیف خاں اور برادر عزیز ابراہیم حسنی ملاقات کے لئے آئے اور کچھ دیر ساتھ بیٹھنے کے بعد ہم کو آرام کرنے کے لئے چھوڑ گئے۔

دوشنبہ ۱۳ اگست ۷۳ء کی صبح کو ہم نے عمان کا رخ کیا، اور ظہر سے پہلے پہنچے ہوائی اڈہ پر ہمارے استقبال کے لئے وزارت اوقاف کے سکریٹری استاذ عبد خلف، پاکستان میں اردن کے سفیر اور رابطہ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے رکن سید کامل الشریف، سعودی مدار المہام استاذ محمد سمیش اور دوسرے حضرات موجود تھے، ہوائی اڈہ سے اردن کے مشہور ہوٹل "انٹر کونٹننٹل اردن ہوٹل" گئے، راستہ میں سید کامل الشریف نے ہم کو بتایا کہ شاہ حسین کو جب وفد کے دورۂ اردن کی اطلاع ملی تو انھوں نے مسرت کا اظہار کیا، اور خوش آمدید کہا، اور توقع ہے کہ وہ کسی وقت وفد کو ملاقات کے لئے یاد فرمائیں، ہم نے اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا جس کا اظہار اس شریف خاندان سے کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے

وزارت اوقاف کی میزبانی

اوقاف اور اسلامی امور کی وزارت کی میزبانی میں ہم نے ہوٹل میں قیام کیا جس کے نگراں اور ذمہ دار ڈاکٹر اسحاق فرحان ہیں۔ وزارت اوقاف کی طرف سے ہر سال ایک تعلیمی و ثقافتی پروگرام چلایا جاتا ہے حسن اتفاق سے ہمارا آنا اسی زمانہ میں ہوا جب اسلامی ثقافت کی اشاعت اور اسلامی شعور بیدار کرنے کے لئے مختلف علمی مجلسیں منعقد کی جارہی تھیں،

لیکچرز کے پروگرام تیار کیے جا رہے تھے، جب ہم دمشق میں تھے، اسی وقت وزارت کے سکریٹری نے ہم سے ان ثقافتی تقریبات میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تھی، اور محترم وزیر اوقاف نے ہندوستان میں راقم سطور کی قیام گاہ پر دعوت نامہ بھی ارسال کیا تھا، وفد کے دورہ اردن کے موقع کو وزارت نے غنیمت جانا، اور وفد کو اپنا مہمان بنا لیا خطبات، ملاقاتوں اور دوروں کا پروگرام مرتب کیا، اور اسے شائع کیا۔

محترم وزیر اوقاف نے ہوٹل میں ہم سے ملاقات کی، آپ مشرق عربی کی گنی چنی تعلیمی و تربیتی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں، اور اسلامی فکر اور اسلامی ذہن رکھتے ہیں، اس سے پہلے تعلیم و اوقاف کی ایک ہی وزارت تھی، بعد میں دو مستقل وزارتیں بنا دی گئیں، ہم نے ڈاکٹر صاحب کو ان کے اسلامی مضامین کے ذریعہ جانا، اسلامی ملکوں میں تعلیم و تربیت کے انداز کے موضوع پر ان کے بعض مقالات ہمارے نزدیک بڑے فکر انگیز ہیں، وزارت میں ان کا وجود ملک کے لئے ایک گراں مایہ نعمت سے کم نہیں، اگرچہ ان کا قدرتی اور صحیح مقام وزارت تعلیم میں ہے، اسی طرح اطلاعات و نشریات کے ڈائرکٹر استاذ علی فریج، ڈاکٹر عبداللہ عزام — جو وفد کے رفیق مقرر ہوئے اور اس دورہ میں جس کا آغاز کابل اور جس کی آخری منزل عمان تھا جن دوستوں سے تعارف حاصل ہوا ان میں دینداری، تقویٰ، غیرت و حمیت اور چستی و سرگرمی ہر اعتبار سے بہت ممتاز تھے — نیز وزارت کے ڈائرکٹر جنرل استاذ عز الدین خطیب اور ہفتہ وار اللواء کے ایڈیٹر استاذ حسن التل نے شرف ملاقات بخشا۔

محترم وزیر اوقاف اور ان کے رفقاء کے ساتھ

وفد نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز شنبہ کے روز ۱۴ اگست ۷۳ء کو ۹ بجے صبح اوقاف

اسلامی امور کے وزیر سے ان کے دفتر میں ملاقات سے کیا، دو گھنٹے کی ملاقات رہی، وزیر موصوف نے وزارت اوقاف کی سرگرمیوں، اس کے میدان کار اور اخیر دور میں اس کے ارتقار اور تبدیلیوں پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ پہلے وزارت اوقاف کی سرگرمیوں کا میدان فوت شدہ اشخاص کے مسائل تھے، اب اس نے زندگی اور زندہ لوگوں کے مسائل کو بھی اپنے دائرہ عمل میں شامل کر لیا ہے، اور مذہبی تعلیمات اور اسلامی ثقافت سے ان کا رشتہ استوار کر رہی ہے، ان کی گفتگو میں پختگی اور بیدار مغزی نمایاں تھی، وہ اسلام اور علم کے پیغام کا فہم اور روح عصر کا شعور رکھتے ہیں، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ وقف کے فقہی احکام و مسائل میں لچک پائی جاتی ہے، وہ زمانہ کا ساتھ دے سکتے ہیں، اور کتاب و سنت اور وسیع فقہ اسلامی کی روشنی میں مسلمانوں کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں، محترم وزیر نے اپنی گفتگو میں وزارت کے انتظامی ڈھانچہ اور وزارت کے تحت چلنے والے اداروں کا مکمل اور تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا جس سے مختصر وقت میں ہم کو خاصی معلومات حاصل ہوئیں اور اس وزارت کے متعلق ایک واضح اور مرتب نقشہ سامنے آیا جو قدیم اسلامی سرمایہ کے تحفظ اور جدید سرمایہ میں اضافہ کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

گیارہ بجے "معہد شرعی" دیکھنے گئے اور اس کے ناظم شیخ محمد ابراہیم شقرہ سے ملاقات کی جن کا شمار اس اسلامی ملک کے ممتاز علمار اور اہل فکر میں ہوتا ہے، وہ عقائد کی پختگی کے ساتھ ایک روشن خیال عالم، اور ایک خوش بیان مقرر بھی ہیں، مدینہ یونیورسٹی میں عرصہ تک معلم رہ چکے ہیں، معہد شرعی سے ملحق "مدرسۃ القرآن" دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔

شاہ حسین سے ملاقات

اس کے بعد اسلامی ثقافتی مرکز ــــ عورتوں کی شاخ ــــ جانا تھا ظہر کا وقت ہو چکا تھا ہم معہد شرعی سے ملی ہوئی مسجد میں نماز ظہر ادا کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک شاہ حسین نے فوری طور پر قصر شاہی میں ملاقات کے لئے طلب کیا، ہم نے نماز ظہر ادا کی پھر وزیر اوقاف کے دفتر گئے جہاں سے سید کامل الشریف کی معیت میں ــــ جن کو قصر تک وفد کے رفیق اور رہنما کی حیثیت سے جانا تھا ــ قصر شاہی کا رخ کیا۔

محل میں داخل ہوئے تو وہاں سعودی عرب میں اردن کے سفیر شیخ محمد امین الشنقیطی سے ملاقات ہوئی جو حال ہی میں شاہ سے ملاقات اور دار الحکومت کے دورے پر آئے ہوئے تھے، ان کی موجودگی سے ہم کو موجودہ شاہ کے دادا ملک عبد اللہ بن حسین مرحوم سے اپنی پہلی ملاقات جو ۲۲ سال پہلے رغدان کے محل میں دوشنبہ کے روز ۶ شوال ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ہوئی تھی، اور دوسری ملاقات کی ــــ جو ۹ شوال ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ہوئی ــــ یاد تازہ ہو گئی۔ اور آج ہم ان کے نامور پوتے سے ملاقات کر رہے تھے، لیکن آج اور کل کے درمیان کتنا گہرا اور عظیم فرق ہے؟

۲۲ سال کا وقفہ ریاضی کے اعتبار سے ایک مختصر وقفہ ہے، اور اشخاص، تو موں خاندانوں اور حکومتوں کی زندگی اور تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، تھوڑی سی مدت میں کبھی کبھی کئی نسلیں گزر جاتی ہیں، حکومتیں تبدیل ہو جاتی ہیں، اگر حوادث و انقلابات، سود و زیاں اور دنیا خصوصاً اس ملک کے سیاسی اور جغرافی نقشہ کی تبدیلیوں کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو یہ ایک طویل وقفہ نظر آتا ہے۔

شاہ حسین کو اپنے جدامجد سے وراثت میں ایک ایسی مملکت ملی ہے جس کو بہت سے ایسے چیلنج، مسائل اور تضادات کا سامنا ہے جن سے اس دور میں شاید ہی کسی حکومت اور مملکت کو واسطہ ہو ان کے حصہ میں قیادت و سربراہی کے لئے بہت نازک اور پیچیدہ وقت آیا ہے، یہ بارگراں غیر معمولی سوجھ بوجھ اور زبردست فہم و بصیرت رکھنے والے لیڈر ہی اٹھا سکتے ہیں، جب میں استقبال کے کمرہ سے انتظار کے کمرہ اور وہاں سے شاہ کے دفتر میں جا رہا تھا، تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں کوئی ڈراما یا خواب دیکھ رہا ہوں، انسان کی بے بسی، زندگی کی بے ثباتی اور زمانہ کی نیرنگیوں پر یقین بڑھتا جا رہا تھا، اس سے پہلے جب میں اردن آیا تھا، تو اپنے معزز میزبان شیخ قاسم امعری تاجر عمان کے گھر میں دسترخوان پر تھا کہ اچانک شاہ عبداللہ کا فوری پیغام پہنچا اور مجھ سے کہا گیا: "سیدنا[1] آپ کو بلا رہے ہیں" میں نے فوراً شاہ کی دعوت پر لبیک کہا، پھر دوسری بار جامع مسجد میں جس میں شاہ نے نماز ادا کی تھی اچانک شاہ کا پیغام پہنچا اور کہا گیا کہ "سیدنا آپ کو بلا رہے ہیں" ـــــ اور آج ان کے نامور پوتے کا اچانک پیغام پہنچا اور ہم سے کہا گیا: "سیدنا آپ کا انتظار کر رہے ہیں" آج اور کل میں کتنی مشابہت ہے، مگر ماضی اور حال میں کتنا زبردست اور نمایاں فرق ہو چکا ہے۔

ہم شاہ کے دفتر میں داخل ہوئے تو وہ چند قدم ہمارے استقبال کے لئے بڑھے، دروازہ کھولا، بہت تواضع اور انکساری سے پیش آئے اور معذرت کی کہ وہ ہم سے اسی پوشاک میں مل رہے ہیں، جس میں وہ تھے، پھر بالکل بے تکلفی سے ہم بیٹھے اور پوری آزادی اور صفائی کے ساتھ گفتگو کی، شاہی رسوم وآداب کا دور دور تک پتہ نہ تھا، گفتگو ملک کی

---

[1] اردن کے لوگ اپنے شاہ کو اسی لفظ سے مخاطب کرتے ہیں، جس کو انھوں نے حجاز سے اخذ کیا ہے اور یہی لفظ رائج ہو گیا ہے۔

اس نازک پیچیدہ اور پریشان کن صورت حال تک پہنچی جس میں ذہانت دور اندیشی، پختہ ایمان اور سچے اور آہنی عزم کا امتحان ہے، اور جس کی بہترین تصویر یہ آیت کریمہ پیش کرتی ہے

حَتّٰٓى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا	یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر
رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ	تنگ ہوگئی، اور ان کی جانیں بھی ان کو دوبھر
وَظَنُّوٓا أَنْ لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّآ إِلَيْهِ	ہوگئیں اور انھوں نے یہ جان لیا کہ خدا (کے
(التوبہ ــ ۱۱۸)	ہاتھ) سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں۔

ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور عملی طور پر تجربہ بھی کیا کہ مسلمانوں اور عربوں خصوصاً اس ملک کے لئے جو شیر کے جبڑوں یا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان واقع ہے، اور نوک شمشیر و سنان پر زندگی گزار رہا ہے، اللہ تعالےٰ کے علاوہ کوئی ملجأ و ماویٰ اور کوئی ناصر و مددگار نہیں ہے، اگر اس کے لئے کوئی راہ نجات ہو سکتی ہے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ دلوں میں ایمان باللہ ہو، اسلام کے لئے اخلاص ہو، اس حقیقت پر غیر متزلزل یقین و اعتماد ہو کہ اسلام ہی زندہ رہنے اور انسانیت کی رہنمائی کرنے کا اہل ہے، زندگی ان تمام آلائشوں اور خرابیوں سے پاک ہو جو اسلام کی سربلندی اور سرخروئی کی راہ میں رکاوٹ اور اس کے زوال و انحطاط کا باعث ہوں، اسلام کو غیر مشروط طور پر زندگی کے تمام گوشوں اور شعبوں میں اسی طرح نافذ اور جاری و ساری کیا جائے جیسا کہ قرآن حکم دیتا ہے، خدا اور اس کے رسول کو دعوت مبارزت نہ دی جائے، اور اس آیت کریمہ پر ایمان لایا جائے :

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى	اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور
حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ	نہ عیسائی، یہاں تک کہ ان کے مذہب کی پیروی
(البقرہ ــ ۱۲۰)	اختیار کر لو۔

میں نے شاہ حسین کو وہ عظیم ذمہ داری یاد دلائی جو فلسطینی پناہ گزینوں، ان کے اور ان کی آئندہ نسلوں کے عقائد کے بارے میں شاہ پر عائد ہوتی ہے، یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے کہ فلسطینیوں کو عیسائی مبلغین اور رفیوجی ریلیف کمیٹیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے جو ان کی زبوں حالی اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں، میں نے کہا :۔

"یہ عظیم ترین ذمہ داری ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، ہم سب ایک روز اللہ تعالےٰ کے حضور کھڑے کئے جائیں گے، اور ان مصیبت زدہ اور قابل رحم لوگوں کے بارے میں ہم سے باز پرس ہوگی جو اپنے وطن سے صرف اس بنا پر نکالے گئے کہ انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار تو بس اللہ ہے"، اسی کے ساتھ میں نے شاہ کے بعض جرأت مندانہ اور دانشمندانہ اقدامات کا اعتراف کیا، اور بعض مواقع پر ان کی بے نظیر شجاعت و جرأت کو سراہا۔

میں نے شاہ سے کہا: ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ اگر میرے پاس صرف ایک ہی دعا ہوتی جسے اللہ تعالےٰ شرف قبولیت سے نوازتا تو وہ دعا میں حاکم شہر کے لئے کرتا، اس لئے کہ اگر وہ صالح ہے تو سارا شہر صالح ہوگا لیکن اگر اس میں خرابی ہے تو سارا شہر خراب ہو جائے گا میں اگرچہ اس مرتبہ پر نہیں ہوں، لیکن میں بھی بات شاہ سے کہنے کی جسارت کرتا ہوں"

شاہ خاموشی اور انکساری سے باتیں سنتے رہے۔ گفتگو میں رفیق محترم استاذ احمد محمد جمال اور سید کامل الشریف بھی شریک تھے، استاذ احمد محمد جمال نے کہا: میں نے بہت سے موقعوں پر کہا ہے کہ ہماری تمام توقعات شاہ فیصل اور شاہ حسین سے وابستہ ہیں"

مجلس برخواست ہوئی تو شاہ ہم کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور آئے پھر ہم نے سلام کیا اور ہوٹل میں اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔

شہر کے اسلامی اداروں کا دورہ

۱۵ر اگست ۸۳ء کو چہارشنبہ کے روز صبح ۹ بجے نکلے اور اس عظیم فلاحی اسلامی اسپتال کی عمارت دیکھنے گئے جو عمان میں فلاحی اسلامی مرکز کی انجمن کی جانب سے قائم ہو رہا ہے یہ ایک زبردست منصوبہ ہے، اگر مکمل ہو گیا تو یہ اسپتال اس عرب اسلامی علاقہ کا عظیم ترین اسپتال ہوگا، اور اس شہر کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرے گا، جہاں ہر طرف عیسائی مشنریاں اور مغربی عیسائی ادارے اسپتال قائم کرتے اور طبی امداد فراہم کرنے میں سرگرم عمل ہیں، اور جو عیسائی تبلیغ کا اہم مرکز رہا ہے، جہاں ایک نازک اور حساس گوشہ سے دلوں میں گھر کرنے اور ذہنوں کو مائل کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، یعنی مریض پر شفقت اس کی دلجوئی، اس کی تکلیفوں کا ازالہ یا کم سے کم ان میں تخفیف اور لطیف و شیریں انداز گفتگو جو دلوں کو چھوتا ہوا اور مسحور کر لیتا ہو، بلاشبہ یہ انسان کی زندگی کا کمزور ترین اور نازک ترین گوشہ ہے۔

یہ اسپتال تعمیر و تزئین کے اکثر مراحل سے گزر چکا ہے، استاذ محمد عبدالرحمٰن خلیفہ اور ان کے معاون استاذ مشہور حسن محمود، جو اسپتال کے پلان اور انجمن کے جنرل ڈائرکٹر ہیں، اسپتال کے مختلف حصوں میں ہم کو لے گئے، اور تمام تفصیلات سے آگاہ کیا کہ کس طرح یہ منصوبہ کامیاب ہوا، اور کس طرح ماہر فن معماروں اور عالمی شہرت کے مالک اطباء کی خدمات حاصل کی گئیں، اسپتال جدید ترین طرز پر تعمیر کیا جا رہا ہے، ترقی یافتہ ترین سازوسامان فراہم کئے جا رہے ہیں، اسی سے ملحق ایک بڑی مسجد، کلچرل سنٹر، لکچروں کے لئے ہال، اسلامی لائبریری، نرسوں کے لئے کوارٹر اور نرسوں اور قابلات کی تربیت کا مدرسہ بھی ہوگا

اس سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے اردن یونیورسٹی کی مسجد دیکھی جو اگرچہ ابھی تعمیر و تکمیل کے مرحلہ میں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد شاندار اور اس اہم مرکز کے شایان شان ہوگی جس میں اثر قبول کرنے کی بہت صلاحیت ہے۔ عمان کے ادارہ اوقاف بھی گئے اور اہم ذمہ داروں کے ساتھ کچھ وقت گزارا، مکتبۃ المسجد الاقصیٰ دیکھا، اس دورہ میں جن بڑے مکتبوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں سے ایک یہ بھی ہے، اسلامی کتابوں سے بھرا ہوا ہے، ہماری اکثر تصنیفات جو بیروت و قاہرہ میں شائع ہوئی ہیں، اس کتبخانہ میں موجود تھیں۔

اسی طرح مسجد احمد قارہ کی زیارت کی جو دار الحکومت کی مرکزی مسجد میں شمار ہوتی ہے، نماز کے پانچوں اوقات میں اس ایک مسجد سے اذان نشر کی جاتی ہے، یہ نیا خیال ہے، جو کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا، یہ اقدام بحث و تنقید کی بڑی گنجائش رکھتا ہے، کیونکہ اگر اتفاق سے کسی وقت اس مسجد کا مائک بیکار ہو جائے، یا مؤذن سو جائے تو سارے شہر کے لوگ اذان سے محروم رہ جائیں گے، مزید براں اذان کی جو فضیلت ہے، اور اذان دینے پر عند اللہ جو ثواب ہے اس سے شہر کی باقی مسجدیں محروم ہو جاتی ہیں، اس مسجد کے مختلف حصوں کو دیکھا، اس کی لائبریری بھی دیکھی، جو جدید طرز پر مرتب کی گئی ہے، عمارت کی دلکشی اور نظم و نسق کی خوش سلیقگی سے مسرت ہوئی۔

یتیم خانہ کے منصوبہ کے لئے جو زمین تجویز کی گئی ہے، وہ بھی دیکھی اسی کے پاس قصبات اور دیہاتوں سے آنے والے حاجیوں کے استقبال اور ٹھہرنے کا مرکز بھی ہے۔

فلسطینی پناہ گزینوں پر ایک نظر

راستہ میں ایک فلسطینی کیمپ سے گزر ہوا، ہم نے دیکھا کہ فلسطینی بچے جن کے آبا و اجداد

کا اسلامی فتوحات اور دعوت اسلامی کی تاریخ میں نمایاں کردار رہا ہے، افلاس اور بدحالی کا شکار ہیں، ان کی حالت کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، جرمن مشنری "مشلفر" کا مرکز دیکھا، جو دفاتر، فرسٹ ایڈ، غذا کی سپلائی اور تعلیم و تربیت کے مختلف شعبوں پر مشتمل ہے، ہم نے کہا: اب بھیڑیوں اور بھیڑوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہے، دونوں کو قسمت کے حوالہ کر دیا گیا ہے، بھلا بھولی، لاغر اور مسکین بھیڑیں، اس طاقتور، فربہ اور خوں آشام بھیڑیئے کے سامنے کیسے زندہ رہ سکتی ہیں، جبکہ دونوں اپنی اپنی فطرت پر ہیں۔

مرکز اسلامی کے استقبالیہ جلسہ میں

شام کو مرکز اسلامی کی فلاحی انجمن دیکھنے گئے، جو درحقیقت اخوان المسلمین اور ان کے بچے کھچے داعیوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہے، اس کے نگراں ہمارے دیرینہ دوست اردن کے مجاہد لیڈر استاذ محمد عبد الرحمٰن خلیفہ ہیں، اس صدی کی پانچویں دہائی میں دعوت اسلامی کے جن اہم کارکنوں سے ہمارا تعارف ہوا ان میں ایک استاذ خلیفہ بھی ہیں، ہماری ان سے پہلی ملاقات دمشق میں ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی، وہ مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لئے دمشق آئے تھے جس کی دعوت ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان نے دی تھی، وہ مہمانوں کو محاذ کی بستیوں اور اردن میں فلسطین پناہ گزینوں کے کیمپوں میں لے جاتے تھے، پھر وہ ہندوستان بھی ہمارے پاس آئے تھے، ہمارا چھوٹا سا گاؤں جو دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کے نام سے معروف ہے، ان کے قدم سے مشرف ہوا، وہ مجھے مؤتمر اسلامی کی شرکت کی دعوت دینے آئے تھے، جو چند ہی دنوں بعد عمان میں منعقد ہونے والی تھی، اس مرتبہ انھوں نے ہمارے اعزاز میں پہل کی اور انجمن کے مرکز میں ایک اعزازی اور تعارفی جلسہ

منعقد کیا جس میں وزیر اوقاف ڈاکٹر اسحاق فرحان، سید کامل الشریف، علماء، عمائد شہر تعلیم یافتہ طبقہ اور دعوت اسلامی کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک معتدبہ تعداد نے شرکت کی، سب سے پہلے استاذ محمد عبدالرحمٰن خلیفہ نے ایک پرجوش تقریر کی جس میں وفد کو خوش آمدید کہا، اور حاضرین سے وفد کے ارکان کا تعارف کرایا، وفد کے بعض ارکان سے اپنے دیرینہ روابط کا ذکر کیا، اور اس شہر کا جو مقام اور عالم اسلامی اور عالم عربی میں اسکی جو نازک حیثیت ہے اس کی وضاحت کی۔

ایک سرحدی اور برسرپیکار اسلامی ملک کی ذمہ داری

استاذ خلیفہ کے بعد میں کھڑا ہوا اور میں نے ایک تقریر کی جس کی روح اور خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، امابعد!

میں استاذ محمد عبدالرحمٰن خلیفہ کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور یہ میرے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ایک بھائی کے دوسرے بھائی، اور ایک دوست کے دوسرے دوست کے ....

بارے میں اظہار خیال ہے جن میں جذبات و احساسات کی ہم آہنگی ہے، جو ہم عقیدہ اور ہم خیال ہیں، جو ہم نوا اور ہم آواز ہیں، خاص طور پر میں اس لئے اپنے فاضل دوست کا نہایت ممنون ہوں کہ انھوں نے اہل فکر و اہل دعوت کی اس منتخب اور نمائندہ جماعت سے تعارف، اور تبادلہ خیال کا موقعہ فراہم کیا، یہی اس طویل سفر کا حاصل، اور اس کی حقیقی قدر و قیمت ہے،

ہم نے آثارِ قدیمہ، اور تاریخی مقامات کی سیر کے لئے یہ سفر نہیں کیا ہے، بلکہ ہمارے سفر کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بھائیوں سے ملاقات کریں، ان سے گفتگو اور تبادلۂ خیال کریں۔

دوستو! اپنے عرب بھائیوں سے جو اس ملک میں رہتے ہیں، توقع تو یہ تھی کہ وہ اسلام کی روشنی کو دور دراز ملکوں تک پہونچائیں گے، اور بلاشبہ انھوں نے عہدِ اول میں اپنا فرض ادا کیا، اور ہم برصغیر کے باشندے ان کے مرہونِ منت ہیں، کیونکہ انھیں کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے ہم کو اسلام کی نعمت سے بہرہ مند فرمایا، آپ کا ملک ہمیشہ دعوتِ اسلام کا مرکز اور سرچشمہ رہا ہے، اور اس ملک کی تاریخ نے، جو فتوحات کی تاریخ ہے، جہد و جہاد کی تاریخ ہے، اسلامی شجاعت و بسالت کی تاریخ ہے، ہم کو ہمیشہ ایمان و یقین، اسلام پر فخر و اعتماد اسلام پر وقتاً فوقتاً ہونے والے حملوں، اور اسلام دشمن تحریکوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت، اور اس راہ میں ثابت قدمی، بلکہ مصائب و حوادث پر صبر کرنے کا حوصلہ بخشا ہے، ہماری مصیبتوں میں اس تاریخ نے ہمارے لئے سامانِ تسلی فراہم کیا ہے، چنانچہ "فتوح الشام" وہ تنہا تاریخ ہے جس میں مسلمان نازک گھڑیوں میں پناہ لیتے تھے، اور اس سے ایمان، حوصلہ، اور مصائب و حوادث کے لئے مقاومت کی طاقت حاصل کرتے تھے، مجھے اپنے بچپن کا زمانہ اب تک یاد ہے جب ہمارے خاندان کی خواتین اکٹھا ہوتی تھیں، اور ان میں سے ایک اردو میں "فتوح الشام" کا منظوم ترجمہ سناتیں، یہ عظیم اسلامی رزمیہ جس کو فتوح الشام سے نقل کر کے ہمارے خاندان کے ایک بزرگ

(سید عبدالرزاق کلامی) نے اردو نظم کا جامہ پہنایا تھا، ۲۸ ہزار[1] اشعار پر مشتمل تھا
ہم ان مجلسوں میں کسی ضرورت سے داخل ہوتے، اور آپ کو معلوم ہے،
بچوں کی ضرورتیں کتنی اور کیسی کیسی ہوتی ہیں۔ اور اپنی ماؤں اور بہنوں کے
پاس جاتے تو دیکھتے کہ آنکھیں اشکبار، اور آنسو رواں ہیں، اور ان صالح،
پاک نفس و پاکباز خواتین کے سروں پر ایمان و سکینت کا بادل منڈلا رہا ہے
وہ ان جگہوں کے واقعات و حالات سنتی ہیں، جن میں صحابہ اور تابعین
شریک ہوتے تھے، کثرت سے شہید اور زخمی ہوتے تھے، سر کٹ کٹ کر گرتے
اور خون کی ندی کا بہہ جاتی تھی، اور مسلمانوں کے قریب ترین و محبوب ترین اعزا
و اقارب ان سے جدا ہو جاتے تھے، تو وہ ان عام اسلامی واقعات کے
سامنے اپنی مصیبتیں بھول جاتی تھیں، اور ان کے دلوں میں مذہبی جوش،
دیدارِ الٰہی کا شوق، اور مصائب کو جھیلنے کے جذبات موجزن ہو جاتے تھے
اسی طرح مرثیہ رزمیہ پڑھتے اور بہت ذوق و شوق سے سنتے تھے، اور
ان کی رگوں میں شجاعت، ایمان، اور شوق شہادت کی بجلی دوڑ جاتی تھی،
اس وقت کے اکثر شریف مسلم گھرانوں اور خاندانوں میں اس کا رواج تھا۔

میں کہہ رہا تھا کہ ان تجربوں کی روشنی میں، اور اس قابلِ فخر، اور روشن و
تابناک تاریخ میں توقع اور امید تو یہ تھی کہ اس ملک میں — جہاں سے محمد صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے دین کے مبلغین کارواں در کارواں نکلے تھے — ہمارے

---

[1] اس منظوم ترجمہ کا نام "صمصام الاسلام" ہے، اور وہ انھیں کی زندگی میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے
چھپ کر مقبول ہو چکی تھی۔

عرب بھائی اٹھ کھڑے ہوتے اور اس عالمگیر پیغام کو ان گوشوں تک پہونچاتے جو اسلام سے بے بہرہ ہیں، اور اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے، لیکن رنج و افسوس کا مقام ہے، اور زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ آج آپ سے یہ درخواست کی جارہی ہے کہ آپ اس سرزمین کا تحفظ کریں گے، جو اسلام کی پونجی اور راس المال ہے، سارا عالم اسلامی اسی اسلامی مرکز کی توسیع اور اس اصل کا سایہ ہے، آپ متن ہیں، ہم اور سارے مسلمان اس کا حاشیہ ہیں، ہم آپ سے طاقت، اعتماد، فخر اور عزت حاصل کرتے ہیں، ہر وہ کمزوری جو یہاں ہوتی ہے، عالم اسلامی کے شہروں اور دارالحکومتوں میں مجسم اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، اگر آپ کسی ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتے ہیں تو دہلی، کراچی، جاکرتا اور دوسرے شہروں میں مسلمانوں کے سر جھک جاتے ہیں۔

حضرات! آپ سب کو معلوم ہے کہ اسلامی فتوحات سے پہلے یہ علاقہ بازنطینی سلطنت کی قلمرو میں تھا، عیسائیت اس علاقہ کا سرکاری اور عام مذہب تھی، یہ بازنطینی سلطنت کا محبوب ترین اور زرخیز ترین علاقہ تھا، اس میں ان کے مقدس مقامات، حضرت مسیحؑ کی جائے پیدائش اور یروشلم تھا، بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا اقتضا ہوا کہ یہاں اسلام کا بول بالا ہو، اور یہ علاقہ مسلمانوں کی سرپرستی اور نگرانی میں داخل ہو، چنانچہ عربوں نے اس کو فتح کیا اور اس میں اسلام کو پھیلایا، اور ان کی زبان و تہذیب کو فروغ ملا، اور وہ ایک اسلامی اور عربی ملک ہو گیا، قدرتی بات تھی کہ عیسائی یورپ اس سے دلچسپی لے، چنانچہ میرا خیال ہے کہ یورپ کی بڑی طاقتوں کا اس علاقہ سے دلچسپی لینا کوئی عارضی

اوران کی تاریخ اور ذہن کی کوئی نئی تبدیلی نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ اس علاقہ کی جانب للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہی ہیں، کسی لمحہ بھی ان کا ذہن اس سے خالی نہیں رہا ہے، متعدد بار اس علاقہ کی بازیابی اور اس پر تسلط حاصل کرنے کی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں، صلیبی جنگیں جن سے آپ سب لوگ واقف ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی، اس مقصد کے حصول کے لئے یورپ اپنے تمام وسائل وذرائع استعمال کرتا رہا ہے، لیکن اس کی تمام کوششیں رائیگاں اور بے سود ثابت ہوئیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو اس ملک پر حکمرانی کرنے اور اس کا تحفظ کرنے کے لئے منتخب فرمایا تھا، وہ طاقتور، امانت دار اور وفادار تھے، اور ہر سودے بازی، دست برداری، سپر اندازی اور ہر قسم کی بے وفائی اور غداری سے دور اور بالاتر تھے، مثال کے طور پر میں صلاح الدین ایوبی کا ذکر کرتا ہوں جس نے صلیبیوں کو شکست فاش دی، اور مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام عطا کیا، اس ملک کے مسلمان حکمران اور لیڈر ـــــ اپنی کمزوریوں اور رجحانات کے اختلاف کے باوجود ـــــ اس ملک کے تقدس اور وقار کے باب میں وفادار اور امین تھے، اور میں تو کہتا ہوں کہ عثمانی ترک حکمران بھی ان اسلامی مقدس مقامات کے سلسلہ میں بہت غیور تھے، چنانچہ پوری پانچ صدیوں تک کھول نے اس ملک کی حفاظت کی، میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے، نہ نسب کا، نہ قومیت ووطنیت کا، اور نہ زبان وتہذیب کا، لیکن حق کی شہادت، تاریخ کے ساتھ انصاف، اور اعتراف حقیقت کا جذبہ یہ کہنے پر مجھے مجبور کرتا ہے، چنانچہ دشمنوں کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں، اس پر تاریخی شواہد موجود ہیں کہ یہودی کانفرنس کا صدر ڈاکٹر ہرٹزل نے

جسے بہت سے لوگ صیہونیت کا پیغمبر کہتے ہیں، سلطان عبدالحمید خاں سے ملاقات کی، اور درخواست کی کہ وہ عثمانی سلطنت کے زیر سایہ یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن قائم کرنے کی اجازت دے دیں، اس کے عوض اس نے عثمانی حکومت کے قرضوں کی ادائیگی (یہ قرضے بہت تھے) اور حکومت کے لئے ایک بحری بیڑہ ـــ جس کے اخراجات یہود برداشت کریں گے ـــ تیار کرنے کا وعدہ کیا، اسی کے ساتھ ساتھ عثمانی حکومت کے استحکام اور ترقی کے لئے مالی تعاون کی پیش کش کی، اس کے علاوہ وہ ذات ہمایونی یعنی سلطان عبدالحمید خاں کی خدمت میں جو قیمتی تحائف پیش کریں گے وہ مزید برآں، سلطان عبدالحمید خاں رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب باتوں کے جواب میں کہا: "یہ دولت اپنے ہی پاس رکھو تمہارے کام آئے گی، میرے نزدیک تو دنیا کے سارے یہودیوں کی دولت بیت المقدس کی مٹھی بھر مٹی کے برابر بھی نہیں ہے" اس کا انجام یہ ہوا کہ یہودیوں نے سلطان عبدالحمید خاں کا تختہ الٹ دیا، اور ان پر جیل میں طرح طرح کے مظالم ڈھائے[1]۔ عثمانی سلطنت اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اسلامی طاقت کا عظیم اور محکم قلعہ تھی جس سے اغیار خوف کھاتے تھے، وہ اس لکڑی کی مانند تھی جسے کسان اپنے کھیت میں کھڑا کر تا ہے، اور اس پر ایک کپڑا ڈال دیتا ہے، تو چڑیا سمجھتی ہے کہ کوئی آدمی کھڑا ہے، یا کوئی ڈراونی شکل موجود ہے، اور کھیت سے قریب نہیں ہوتی، مگر جب یہ لکڑی گر جاتی ہے، یا کوئی سیانا کوا سمجھ جاتا ہے کہ یہ لکڑی ہے

---

[1] یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی یہودیوں کے اشارے اور سازش سے عمل میں آئی، ان کے پاس معزولی کا فرمان لے کر جو گیا وہ بھی ایک یہودی تھا۔

یا اسے زمین پر پڑی ہوئی دیکھتا ہے، تو چڑیاں اس کھیت پر پل پڑتی ہیں اور فصل کو تباہ کر دیتی ہیں، یہی اس ملک کا قصہ ہے جس پر عثمانی سلطنت حکومت کرتی تھی، دشمن اس سے ڈرتے تھے، اور قریب آنے کی جرأت نہیں کرتے تھے، لیکن جب یہ قلعہ مسمار ہو گیا، اور یہ ڈراؤنی لکڑی گر گئی، تو اس پر پل پڑے اور اس کی تکا بوٹی کر دی۔

عثمانی سلطنت کے زوال اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اس ملک میں جن لیڈروں سے یورپ کو سابقہ پیش آیا، وہ مادہ پرستی اور مغربی تہذیب سے غیر معمولی حد تک متاثر تھے، جدید مغربی نظام تعلیم کے مہلک اثرات نے ان کو اس طرح کھوکھلا کر دیا تھا جس طرح دیمک لکڑی کو کھوکھلا کر دیتی ہے، یہ لیڈر بے ضمیر، وعدہ شکن، غیرت دینی سے محروم، اور سچی وطن دوستی، اور وفاداری سے عاری تھے، یورپ نے یہ دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا، اور اسے یقین ہو گیا کہ ضمیر کی سودے بازی، اور اس علاقہ پر تسلط حاصل کرنے کا وقت آ گیا ہے، وہ علاقہ جو اسے ہر دور میں محبوب رہا ہے، چنانچہ ہمارے لیڈروں نے ایسی مادہ پرستی اور ضمیر فروشی کا ثبوت دیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائیداری کے باب میں ان کا زاویۂ نگاہ یکسر بدل چکا تھا، ارشاد الٰہی :-

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ	اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے، اور (ہمیشہ کی زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے،

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ (العنکبوت ۶۴)	کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔
اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	جان رکھو کر دنیا کی زندگی محض کھیل
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ	اور تماشا، اور زینت و آرائش اور
بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ	تمہارے آپس میں فخر و ستائش، اور
وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ	مال و اولاد کی ایک دوسرے سے
الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ	زیادہ طلب و خواہش ہے، اس کی
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ	مثال ایسی ہے، جیسے بارش کہ اس سے
وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ○	کھیتی اگتی، اور کافروں کو کھیتی بھلی لگتی
(الحدید۔ ۲۰)	ہے، اور پھر وہ خوب زور پر آتی ہے
	پھر اے دیکھنے والے تو اس کو دیکھتا
	ہے کہ پک کر زرد پڑ جاتی ہے، پھر
	چورا چورا ہو جاتی ہے، اور آخرت میں
	کافروں کے لئے عذاب شدید ہے۔

اور ارشاد نبویؐ:۔

اللھم لا عیش الا عیش	اے اللہ آخرت کی زندگی کے سوا
الاخرۃ۔	کوئی زندگی نہیں۔

خدا پر سے لوگوں کا یقین اٹھ گیا، اور دنیاوی عزت، اور جاہ و منصب کے حصول کے لئے اس طرح تگ و دو کرنے لگے، جیسے یہی چیزیں زندگی کا حقیقی نصب العین ہوں، اقتدار کی راہ میں اصول و اقدار، عزت و ناموس،

اخلاق و روایات ہر چیز کو بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار ہو گئے۔

دوستو! اولین معرکہ میدانِ جنگ سے پہلے انسان کے دل و ضمیر میں برپا ہوتا ہے، اور جب انسان دل و ضمیر کے داخلی معرکہ میں فتح یاب ہو جاتا ہے، تو خارجی معرکوں میں اس کی کامیابی اور فتح یقینی اور لازمی شے بن جاتی ہے، ضمیر کا معرکہ جنگی معرکوں سے پیشتر اور بیشتر دوسرے لفظوں میں مقدم اور زیادہ اہم ہوتا ہے ـــــ ہم ضمیر کے معرکہ میں شکست کھا چکے ہیں، ہمارے دل و ضمیر بکاؤ مال سامان خرید و فروخت بن چکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دشمن کے ناپاک اور توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، اور ہر اجنبی کے لئے راہ ہموار ہو گئی، جب دشمن کا تسلط ان ملکوں پر ہو جاتا ہے تو جس طرح چاہتا ہے خود برو کرتا ہے۔ اپنے تمام عزائم اور منصوبوں کو تکمیل کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے، اور ملک اس کے سامنے بے بس اور مجبور ہوتا ہے، وہ تڑپتا ہے، مگر دشمن کا ہاتھ پکڑ نہیں سکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ قوم کے ساتھ بے وفائی، اور وطن کے ساتھ غداری سے روکنے والی چیزیں دو ہی ہو سکتی ہیں، پہلی چیز طاقتور عقیدہ ہے، اور یقیناً عقیدہ ہی سب سے قابلِ اعتماد اور مضبوط ترین شئے ہے، دوسری چیز سچی حب الوطنی ہے، جس نے مغربی، اور بعض مشرقی قوموں کے لیڈروں کو اس شرمناک جرم کے ارتکاب سے محفوظ رکھا، لیکن ہمارے سربراہوں اور لیڈروں کے لئے کون سا جذبہ مانع ہو سکتا ہے، جن کے پاس نہ عقیدہ ہے، اور نہ سچی حب الوطنی، یہی وجہ ہے کہ اکثر ہم سنتے ہیں کہ فلاں رہنما اور پارٹی لیڈر نے عرب اسلامی وطن کے بعض اہم اور جنگی علاقے دشمن کو

فروخت کر دیئے، یا فلاں لیڈر دشمن کا آلۂ کار اور ایجنٹ ہے، اور بسا اوقات ایسا نظر آتا ہے کہ اسکو خود دشمن سے زیادہ اس کے مفادات سے دلچسپی ہے گویا مدعی سست گواہ چست کا معاملہ ہے۔

حضرات! آپ اسلام کے نازک ترین محاذ، اور مسلمانوں کے آخری قلعہ میں رہتے ہیں، سیلاب شہر کی فصیلوں تک پہونچ چکا ہے، اگر سیلاب فصیلوں کو پار کر گیا، تو کوئی بند اس کو روک نہیں سکے گا۔ آپ آخری دفاعی لائن پر تعینات ہیں، اگر یہ لائن دشمن نے پار کرلی تو سارا عالم اسلامی اس کے پیروں تلے ہوگا، سارے مسلمانوں کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں تو آپ ہی ان کی سربلندی و سرخروئی کا سرچشمہ اور ان کی طاقت و عزت کا سرچشمہ ہیں، میں نہیں کہتا کہ آپ اپنے اور اپنے ملک کی عزت و سربلندی کے بارے میں خدا سے ڈریئے، میں تو آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ خدا سے ڈریئے مسلمانوں کی عزت و ناموس اور اسلام کی سربلندی و سرخروئی کے بارے میں خدا سے ڈریئے، ان مسلم قوموں کے بارے میں جو آپ کو اولین مسلمانوں اور اسلام کے اولین علمبرداروں کا نمونہ سمجھتی ہیں، خدا سے ڈریئے ان معصوم روحوں کے بارے میں جنھوں نے ابھی عالم اجسام میں قدم نہیں رکھا ہے، جو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گی، اور آپ کی ممنون ہوں گی، اگر آپ نے ان کی مقدس اور قابل احترام چیزوں کی حفاظت کی، اور انھیں ایک تابناک ماضی عطا کیا جو ان کے لئے باعث افتخار ہو، جس پر وہ ناز کرسکیں، ورنہ بارگاہ خداوندی میں فریاد کریں گی کہ آپ نے ان کے مقامات مقدسہ کو کھو دیا، ان کے ماضی کو داغدار کر دیا، اور ان کے لئے ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔

اس اجتماع اور اس مبارک موقع نے میرے دل میں غموں کا ایک طوفان

برپا کر دیا ہے، میرے زخموں کو تازہ کر دیا ہے، کیونکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسئلہ کو ایک مسئلہ سمجھتا ہوں، میں پورے عالم اسلام کو ایک ملک سمجھتا ہوں، میرے نزدیک مسلمانوں کو پیش آنے والا ہر حادثہ، اور عالم اسلامی کی ایک انچ زمین پر بھی دشمن کا قبضہ دردناک المیہ ہے، مجھے ہر جگہ مسئلہ فلسطین نظر آتا ہے، اور جہاں بھی جاتا ہوں، باچشم نم کھڑا عربی شاعر متمم بن نویرہ کے اشعار پڑھنے لگتا ہوں ؎

لقد لامني عند القبور على البكا	رفيقي لتذراف الدموع السوافك
وقال أتبكي كل قبر رأيته	لقبر ثوى بين اللوى والدكادك
فقلت له ان الشجا يبعث الشجا	فدعني فهذا كله قبر مالك

ترجمہ:۔ قبروں کے پاس سیل اشک بہانے پر میرے رفیق سفر نے مجھے ملامت کی۔

اور اس نے کہا کیا تم صرف اس قبر کی وجہ سے جو لوی اور دکادک کے درمیان واقع ہے ہر قبر کو بھی دیکھتے ہو آنسو بہانے لگتے ہو۔

تو میں نے کہا ایک غم دوسرے غم کو تازہ کر دیتا ہے، میرے لئے یہ تمام قبریں مالک[1] ہی کی ہیں۔"

میری تقریر کے بعد استاد یوسف العظم کھڑے ہوئے، اور وفد کا استقبال کرتے ہوئے ایک مؤثر تقریر کی، اور مسلمانوں کو خصوصاً اس ملک کے مسلمانوں کو جس کڑی آزمائش صبر آزما اور ہمت شکن حالات کا سامنا ہے، اور جس ذہنی و نفسیاتی کشمکش سے وہ دوچار ہیں اس پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی۔

---

[1] مالک شاعر کا بھائی تھا، جو جنگ ارتداد میں مقتول ہوا تھا، متمم ساری عمر اس کو روتا رہا۔

موتمر اسلامی کے مرکز میں

شام کو ۷ بجے موتمر اسلامی کے دفتر گئے جس کے صدر استاذ کامل الشریف ہیں، وہاں موتمر کے ممبران اور متعلقین سے تعارف ہوا۔

وزیر اوقاف کی جانب سے عشائیہ

وزیر اوقاف نے مہمان وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات، اور فضلا، بڑی تعداد میں شریک تھے، انھیں میں ہمارے پرانے دوست بزرگ و برگزیدہ عالم شیخ مصطفےٰ احمد زرقا بھی تھے، جو آج کل عمان میں کلیۃ الشریعۃ میں استاذ ہیں اور اسلامی شہری قانون ترتیب دے رہے ہیں، امید ہے کہ یہ قانون ملک میں نافذ کیا جائے گا۔

ملاقاتیں

جمعرات کے روز ۱۶ اگست ۱۹۷۳ء کو متعدد علما، اور تعلیم یافتہ حضرات نے اپنی ملاقات سے نوازا مثلاً رابطۃ العلوم الاسلامیہ کے صدر استاذ نذیر ظبیان، سعودیہ میں اردن کے سفیر شیخ محمد امین الشنقیطی اور کردی مجاہد شیخ امین بروسک، شیخ امین بروسک سے ہماری پہلی ملاقات ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی ہم کو ان کا ایک شعر بھی یاد تھا جو انھوں نے اس وقت کے ایرانی وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق کے پاس تار میں لکھا تھا جنھوں نے ایران میں اپنے جرأت مندانہ اقدامات کے ذریعہ خصوصاً پٹرول کو تو میا کر ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

لقفت عصاك عصيهم فتصايحوا
لا سحر بعد اليوم انت مصدّق

ترجمہ :- تمہاری لاٹھی ان کی لاٹھیوں کو نگل گئی، اور وہ چیخ پڑے، اب کوئی جادو چل نہیں سکتا، بلاشبہ تم اسم با مسمّیٰ مصدق ہو۔[1]

وفد جب تک عمان میں مقیم رہا، شیخ امین بروسک برابر ملاقات کے لئے آتے رہتے اور ان کے اشعار، جہاد کے واقعات اور ان کی دلچسپ گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا رہتا۔

سلط میں تقریر

آج سلط میں راقم سطور کی تقریر کا پروگرام تھا، چنانچہ عصر کے وقت ۴ بجے ہم سلط روانہ ہو گئے، پہاڑوں اور وادیوں کے مناظر، پیچ وخم کھاتے ہوئے راستوں کو دیکھ کر ان عرب فاتحین کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی کا اندازہ ہو رہا تھا جنھوں نے ان تمام مشکلات کے باوجود اس ملک کو فتح کیا، اور اسلام سے روشناس کیا، مجھے خیال ہوا کہ آج کی گفتگو ان اولین عرب مسلمانوں پر ہونی چاہیے جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت عطا کی جس نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی، ان کو ایک نئی زندگی سے ہم کنار کیا، اور ساری دنیا سے الگ تھلگ جس محدود ماحول اور جس تنگ و تاریک قفس میں وہ زندگی گزار رہے تھے، اس سے نکال کر اسلام نے ان کو کھلی فضا اور وسیع تر زندگی سے آشنا کیا، میں نے جاہلیت اور اسلام کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے، عربوں اور سارے عالم کی نشاۃ ثانیہ

---

[1] یعنی تم واجب التصدیق ہو۔

کے سلسلہ میں اسلام کے ناقابل فراموش احسان عظیم پر تفصیل سے روشنی ڈالی، تقریر میں خاصا مجمع تھا جلسہ گاہ حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، تقریر کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

استاذ کامل الشریف کے دولت کدہ پر

سفیر محترم سید کامل الشریف نے وفد کے اعزاز میں اپنے دولت کدہ پر عشائیہ دیا

عمان سے اربد

۷ ار اگست ۱۹۸۲ء جمعہ کا روز اربد کے دورہ کے لئے مقرر تھا، اربد عمان کے بعد اردن کا وہ مرکزی شہر سمجھا جاتا ہے جس پر اسلامی چھاپ ہے، اور اپنی دینی غیرت اور اسلامی جذبات کے لئے مشہور ہے، یہ شہر اردن کی شمالی سرحدوں پر واقع ہے، اربد کا سفر بہت تاریخی اور دلچسپ رہا، مختلف تاریخی آثار و مقامات اور یہاں کی قدیم تہذیب کے نشانات دیکھنے کا موقع ملا، عمان سے چلے تو لبقعہ نامی ایک میدان سے گزر ہوا، جہاں فلسطینی پناہ گزینوں کا ایک کیمپ نظر آیا، جو چند ٹوٹے پھوٹے گھروں پر مشتمل تھا، کچھ گھر اینٹ کی پتلی دیواروں سے بنائے گئے تھے، اور کچھ سیمنٹ کی پلیٹوں سے بستی میں بازار اور دوکانیں بھی تھیں، افلاس اور بدحالی کا تاریک سایہ ہر طرف اپنے پر پھیلائے ہوئے تھا، بستی کے قریب بچوں کی تعلیم کے لئے ایک مشن اسکول تھا۔

لبقعہ کے بعد "جرش" میں ٹھہرے، جرش کا شمار قدیم رومی کھنڈرات میں ہوتا ہے، جو زبان حال سے رومیوں کی ترقی یافتہ تہذیب اور تمدنی عروج و صناعی کی شہادت

دے رہے ہیں، یہ باقی ماندہ آثار ان کے ورزشی اور مردانہ کھیلوں سے غیر معمولی دلچسپی کا بھی پتہ دیتے ہیں، جو (یورپ کی تاریخ تہذیب و اخلاق کے بیان کے مطابق) سنگدلی، بربریت اور ایذا رسانی سے لطف اندوز ہونے کی حد تک پہنچ گئی تھی، اس وقت کے ایک اسٹیڈیم کے واضح نشانات بھی پختہ نشست گاہوں اور بلند ستونوں کی شکل میں موجود ہیں، شہر سے اسٹیڈیم تک پختہ سڑکیں ہیں، جو ڈسپلن اور فن تعمیر کے عمدہ ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔

جرش کے بعد ایک دوسرا علاقہ آیا، اس میں "سوف" نامی فلسطینی پناہ گزینوں کا ایک کیمپ ہے، اربد پہنچنے سے پہلے ایک اور کیمپ سے بھی گزر ہوا جو "مخیات الحسن" کے نام سے مشہور ہے۔

شمالی سرحدوں پر —— تاثرات

اربد کو ایک طرف چھوڑ کر ہم نے شمالی سرحدوں کی سمت اپنا سفر جاری رکھا، آخر کار پہاڑی علاقہ میں پہنچے اور ام القیس نامی بستی میں ٹھہرے، گولان کی پہاڑیاں —— جن کا نام محل وقوع کی جنگی اہمیت کی بنا پر جنگ کے دنوں میں ساری دنیا میں گونج رہا تھا —— ہمارے سامنے کھڑی تھیں، ہمارے اور ان کے درمیان ایک گہری وادی تھی جس میں دریائے یرموک سانپ کی طرح مڑتا، چکتا اور بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ حافظے کے پردے پر یرموک کا واقعہ ابھر آیا، اور پھر یادیں تازہ ہو گئیں، اور زخم ہرے ہو گئے اور اندلسی شاعر صالح بن شریف الرندی کے یہ اشعار ہماری زبان پر تھے۔

حتی المحاریب تبکی وھی جامدۃ   حتی المنابر ترثی وھی عیدان

محرابیں بھی آہ وبکا کر رہی ہیں، حالانکہ وہ جامد ہیں، منبر بھی مرثیہ خواں ہیں، حالانکہ وہ بے جان لکڑیوں کے سوا کچھ نہیں۔

اس طرح کا منظر دیکھ کر دل پگھلنے لگتا ہے بشرطیکہ دل میں ایمان ویقین کی چنگاری موجود ہو۔

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
إن کان فی القلب اسلام وایمان

اس وادی میں دو آبادبستیاں موجود ہیں، ایک دریا کے جنوب میں دوسری شمال میں، دریا کے شمالی جانب اور گولان کی پہاڑیوں سے دور تک کا علاقہ شام کے قبضہ میں تھا، اور جنوبی حصہ پر اردن کی حکمرانی تھی، جو اب بھی باقی ہے، مگر ۶۷ء کی جنگ میں شمالی علاقہ شام کے ہاتھ سے جاتا رہا، اور گولان پر اسرائیل کا قبضہ ہوگیا۔

گولان کی پہاڑیوں کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد حقیقت کا جتنا صحیح علم اور صورت حال کا جتنا صحیح اندازہ ہوا وہ پچاس کتابیں پڑھنے کے بعد بھی نہیں ہوسکتا تھا ان قدرتی انتظامات وتحفظات کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے، جن کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے اس ملک کو دشمنوں سے بالکل محفوظ کر دیا ہے، یہ پہاڑیاں صرف پہاڑیاں نہیں ہیں بلکہ نہایت مضبوط قلعے ہیں، جن کو فتح کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے، اس ملک کی جانب جس پر اللہ تعالےٰ کے بے شمار احسانات ہیں کوئی دشمن اسی وقت آنکھ اٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے، جب اس کے باشندے اس عظیم احسان کو فراموش کر جائیں، جو ان قدرتی فصیلوں اور قلعوں کی تشکیل میں نظر آتا ہے، اس زرخیز سرزمین کی ناقدری کرنے لگیں جو ان کے لئے دودھ اور شہد کی نہریں بہا رہی ہے اور جس نے اسلامی دعوت ،

اسلامی فتوحات اور اسلامی تہذیب کے میدانوں میں نمایاں تعمیری کردار ادا کیا ہے، اور وہ اپنی عزت وناموس کے تحفظ سے بالکل غافل اور بے پروا ہو جائیں، گولان کی پہاڑیاں ایسا قلعہ ہیں، جو دیا تو جا سکتا ہے، مگر لیا نہیں جا سکتا، ملک کے ساتھ غداری کرکے کسی کے حوالہ ..... تو کیا جا سکتا ہے، مگر زبردستی اس کو چھینا نہیں جا سکتا، آج یہ قلعہ اسرائیل کے قبضہ میں ہے، اور اس کی توپیں کسی وقت بھی ایک طرف اربد پر اور دوسری طرف دمشق پر آسانی سے گولہ باری کر سکتی ہیں۔

گولان کے شمال میں بحیرۂ طبریہ ہے جس کے ساحل پر طبریہ نامی اسرائیلی شہر آباد ہے، یہ شہر ام القیس کے ٹیلوں پر کھڑے ہونے سے صاف نظر آتا ہے، اور اردنی علاقہ میں واقع نہر یرموک کے ساحل سے وہ شامی علاقہ بھی دیکھا جا سکتا ہے جس پر اسرائیل کا قبضہ ہے، اور جو وہاں سے چند کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، شام کی مشہور بستی "حمہ"[1] اس علاقہ میں ہے، جس کے مکانات سنسان اور مسجدیں ویران ہو چکی ہیں، اسرائیلی حکومت نے اس علاقہ میں ضرورت کے مطابق کئی سڑکیں بنا دی ہیں۔

اس دورے سے ہم سب نہایت افسردہ، غمگین اور شکستہ خاطر واپس آئے، شہر کی ایک مرکزی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی، خطیب نے موثر اور فصیح وبلیغ خطبہ دیا، پھر شہر کے ایک سربرآوردہ شخص کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا، کچھ دیر آرام کیا اور نماز عصر ادا کرنے کے بعد لکچر ہال کا رخ کیا، ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا، تعلیم یافتہ خواتین بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں، حاضرین نے پرجوش اسلامی نعروں سے ہمارا استقبال کیا، جس سے شہر کے اسلامی مزاج کا پتہ چل رہا تھا۔

---

[1] یہ شام کا مشہور شہر "حماۃ" نہیں ہے جس کو عام طور پر "حما" بولا جاتا ہے۔

اربد میں تقریر: اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہائے نظر

تقریر کا موضوع تھا: اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہائے نظر" تقریر میں اسلام کے مقام، کردار اور اس کے مستقبل کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف حلقوں میں جو مختلف زاویہ نظر پائے جاتے ہیں، ان کا جائزہ لیا گیا تھا۔ مثلاً بعض لوگوں کے نزدیک اس سائنٹفک اور ایٹمی دور میں اسلام اور اسلامی نظام کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، ان میں سب سے ممتاز اور اسلام پسند نقطہ نظر ان حضرات کا ہے، جن کا خیال ہے کہ اسلام ایک محدود دنیا اور پسماندہ دور میں آیا تھا، اور اپنا اصلاحی رول ادا کر چکا، اس نے بہت سی اجتماعی خرابیوں کو دور کیا، خرافات و اوہام کو ختم کر کے بعض قابل قدر اصلاحات بھی کیں، اس دور میں اسلام یقیناً فائدہ سے خالی نہیں تھا جب نہ سائنس کا وجود تھا نہ تہذیب و تمدن نے اتنی ترقی کی تھی، اور نہ جدید اختراعات سامنے آئی تھیں، ایک طبقہ اپنی رواداری اور اسلام دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یقیناً اسلام نے انسانیت کے ارتقاء میں اہم رول ادا کیا ہے، انسانیت پر اسلام کا بہت احسان ہے، لیکن آج وہ اس خالی خول بندوق کی طرح ہے، جو اپنا کام کر چکی ہو، اس ایٹمی دور میں جبکہ تمدن، ٹکنالوجی، سائنس، سیاست اور فلسفہ اپنے نقطہ عروج پر ہیں، اسلام کا تجربہ کرنا وقت اور طاقت کے ضیاع کے مرادف ہوگا، میں نے اس زاویۂ نگاہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: یہ زاویۂ نگاہ بالکل غلط اور غیر منصفانہ ہے، جو اسلام کو سمجھتا ہے نہ اس زمانہ کے مزاج اور اس کے ان پیچیدہ مسائل کا شعور رکھتا ہے، جن کا دور حاضر کے مفکرین اور لیڈروں کے پاس کوئی حل نہیں ہے، انسانیت کا بیڑا پار کرنے، اس دور کے مسائل کو حل کرنے اور حالات کو صحیح رخ دینے کے سلسلہ میں

اسلام کیا کردار ادا کرسکتا ہے، اس سے یہ طبقہ بالکل ناآشنا ہے۔

میں نے کہا "یہ عجیب بات ہے کہ وہی غیر اسلامی فلسفے اور نظامہائے حیات جن پر موجودہ قوموں کو یقین ہے، اور انھوں نے ان کا تجربہ کیا اور کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی جب عربوں نے ان فلسفوں اور نظاموں کا تجربہ کیا تو تاریخ شاہد ہے کہ انھیں اس تجربہ میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جب انھوں نے قومیت، اشتراکیت یا کمیونزم کو اختیار کیا تو حالات سدھرنے کی بجائے اور خراب ہوگئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے عربوں کا مستقبل اسلام کے مستقبل سے وابستہ کردیا ہے، اور ان دونوں کے درمیان ایک لازوال اور ناقابل شکست رشتہ قائم کررکھا ہے گویا عرب ایک ایسی امت ہیں جس کے پاس ایک مخصوص پیغام اور متعین نصب العین ہے، اور اللہ تعالےٰ نے انھیں اسلام کی اشاعت اور اس کے تحفظ کے لئے منتخب فرمایا ہے، ان کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے نظام زندگی کو اختیار کریں، ان کی مثال اس محبوب اور لاڈلے طالب علم کی ہے، جو اپنی غیر معمولی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر استاذ کا مرکز توجہ بن گیا ہو، اور اسی وجہ سے اگر وہ اسکول سے غیر حاضری کرتا ہے تو استاذ کسی قسم کی نرمی نہیں برتتا اس کو بے مہار اور آزاد نہیں چھوڑتا۔ غبی، کند ذہن اور آوارہ لڑکوں کی استاذ کوئی پرواہ نہیں کرتا مگر یہ ذہین اور منظور نظر طالب علم اگر غلطی کرتا ہے تو استاذ اس کو سزا دیتا ہے، یہ اگر غیر حاضر ہوتا ہے، تو باز پرس کرتا ہے، یہ اگر غفلت اور سہل انگاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کو تنبیہ بلکہ بعض اوقات زجر و توبیخ کرتا ہے۔

حالیہ واقعات نے اور اسلامی ممالک جس خوف و ہراس اور جس بے چینی اور بحران سے دوچار ہیں اس نے ثابت کردیا ہے کہ عربوں کو اسلام کے سایہ ہی میں پناہ

مل سکتی ہے، ان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ خلوص دل سے اسلام کو اپنائیں، نفاق اور دورُخے پن کی راہ ترک کر دیں، راحت طلبی، تعیش پسندی، عیش کوشی اور بے حیائی سے بھرپور رنگین اور غیر سنجیدہ زندگی کو خیرباد کہہ دیں، لذتیت اور مفاد پرستی کے فلسفہ کو اپنی زندگی سے خارج کر دیں، اگر عرب شریفانہ اور باعزت زندگی گزارنا، اور نصرت الٰہی کے حقدار بننا چاہتے ہیں تو ان کو اس طرح رہنا چاہیے جس طرح کوئی قوم ہنگامی حالات ایمرجنسی میں یا سرحدوں اور محاذوں پر زندگی گزارتی ہے، انھیں معتدل، سادہ اور متقشفانہ اور مجاہدانہ زندگی گزارنی چاہیے۔"

تقریر نے حاضرین سے تائید وتحسین حاصل کی اور ریکارڈ کی گئی، اور جب ہم اربد سے روانہ ہو رہے تھے، تو گھروں اور بازاروں سے ریکارڈ شدہ تقریر سنائی دے رہی تھی۔

مجاہد اسلامی عبد اللہ التل کا انتقال اور ان کے کنبہ کی تعزیت

عمان میں داخل ہو رہے تھے کہ اچانک مشہور اسلامی رہنما اور مجاہد جنرل عبد اللہ التل کے انتقال کی افسوسناک خبر سنی، میری ان سے ملاقات ۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں استاذ محمد علی الطاہر کی قیام گاہ پر ہوئی تھی، فلسطین کے محاذ پر ان کی سرفروشی اور جہاد کے کارنامے اور مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں ان کی استقامت اور ثابت قدمی کی خبریں سننے میں آتی تھیں، مجاہد اور قائد ہونے کے ساتھ ساتھ موصوف ایک اچھے مصنف[1] بھی تھے، ان کی وفات کی خبر سے صدمہ ہوا

---

[1] ان کی ایک ضخیم اور پُر از معلومات کتاب "خطر الیھودیۃ العالمیۃ علی الاسلام والمسیحیۃ" دار القلم کویت نے چند سال پہلے شائع کی، معرکہ فلسطین کے متعلق ان کی ڈائری بھی ۱۹۵۹ء میں چھپ چکی ہے۔

ہمارے نزدیک ہم پر اور ہر مسلمان پر جو مرحوم کے مجاہدانہ کارناموں اور اسلام اور ملک کے لئے ان کی قربانیوں کی قدر کرتا ہے، مرحوم کا یہ حق ہے کہ ہم ان کے خاندان کی تعزیت کریں اور ان کے دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ کچھ وقت گزاریں چنانچہ ہم مرحوم کے گھر گئے ان کی تعزیت کی اور مرحوم کے کارناموں کا تذکرہ اور اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

لہو ولعب اور تفریحات کا مرکز

تعزیت کا فرض انجام دینے کے بعد عمان واپس آئے، ہر مرتبہ آمد ورفت میں مدینۃ الملاہی سے ہمارا گزر ہوتا تھا، جو دارالحکومت کے مضافات میں واقع ہے، ایسے سنگین حالات میں جبکہ قوم موت وحیات کی کشمکش سے دوچار ہے، اور ہر وقت جنگ کا خطرہ درپیش ہے، مدینۃ الملاہی کے وجود پر ہم کو سخت تعجب ہوا، اور معلوم ہوا کہ اس شہر میں سات حوض (SWIMING POOLS) ہیں، جن میں آزادانہ اختلاط کے مواقع ملتے ہیں، ان میں سے ایک حوض "فندق عمان" جس میں ہمارا قیام تھا، کے پاس کا تھا، شہر میں سینما گھر، کلب اور آزادانہ تفریح کے مرکز بڑی تعداد میں موجود ہیں، دوسری طرف ملک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے، جو نہیں معلوم کب پھٹ پڑے، اور اس ملک کو تباہی کے اندھے غار میں پہنچا دے، یہ نامناسب صورت حال ملک کے سیاسی جنگی اور مذہبی حالات سے کسی طرح بھی میل نہیں کھاتی۔

معلوم ہوا کہ اس شرمناک صورت حال کو جو اسلام کے سادہ، سنجیدہ اور پروقار مزاج کے قطعاً منافی ہے، غیر ملکی اور خارجی طاقتوں سے غذا ملتی ہے، یہ طاقتیں اس کے بقا اور فروغ کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، اسلامی ملکوں کے حالات کا مطالعہ کرنے اور

ان کی اخلاقی انارکی اور روحانی دیوالیہ پن کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس صورتحال کا لازمہ ولد بڑی حد تک امریکا ہے، امریکا چاہتا ہے کہ یہ ممالک فکری اور اخلاقی انحراف کا شکار ہو کر اس کی پناہ لینے اور اس کی زلہ ربائی کرنے پر مجبور ہوں، اور اپنے طاقتور حریف اسرائیل کے مقابلہ میں نہایت کمزور اور اندرونی طور سے بالکل کھوکھلے ہو جائیں، ان حالات کے باقی رہنے اور بد سے بدتر ہونے میں امریکا کے ساتھ ساتھ ویٹکان (VATICAN) کے مفادات بھی پوشیدہ ہیں۔

اصحاب کہف کے غار میں

۱۸ ر اگست ۱۹۷۳ء کو سنیچر کے روز اصحاب کہف کا غار دیکھنے گئے جو عمان کی ایک بستی میں واقع ہے، ہماری رہنمائی آثار قدیمہ کے مشہور ماہر اردن کے مدیر آثار عامہ کے فنی معاون استاذ رفیق وفا دجانی کر رہے تھے، انھیں پورا یقین تھا کہ اصحاب کہف نے جن کا قصہ سورہ کہف، عیسائی صحیفوں اور تاریخ، ادب کی کتابوں میں مذکور ہے ——— جس غار میں پناہ لی تھی، وہ یہی غار ہے، میں اپنی کتاب "معرکۂ ایمان و مادیت" ——— یا "سورہ کہف کا مطالعہ" میں اس موضوع پر بحث کر چکا ہوں، اور میں نے اکثر مصنفین کے اس خیال کو راجح قرار دیا تھا، کہ یہ قصہ "افسوس" یا "افسیس" نامی شہر میں وقوع پذیر ہوا تھا، شہر ایشیائے کوچک میں ازمیر سے ۶۰ کیلومیٹر دور دریائے قیسطرہ کے جنوبی ساحل پر انا طولیہ کے ۱۲ ایونی شہروں میں سے ایک تھا، یہ شہر اس وقت ترکی میں ہے، اور "طرسوس" کے نام سے مشہور ہے، اور جس غار میں اصحاب کہف نے پناہ لی تھی، وہ اسی شہر کے نواح میں ایک پہاڑ میں تھا، پہاڑ کا نام (ANCHILIS) تھا، لیکن استاذ توفیق اس پر مصر تھے کہ

اصحاب کہف کا غار یہی "کہف الرجیب" ہے جس کو دیکھنے... ہم لوگ گئے تھے، اس خیال کے حق میں ان کے پاس بہت سے دلائل اور شواہد ہیں، جن کی علمی اور تاریخی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ دلائل انھوں نے اپنی کتاب "اصحاب کہف کے غار کا انکشاف" (اکتشاف کہف اهل الکهف) میں تفصیل سے بیان کئے ہیں، اور اس کا ایک نسخہ ہم کو ہدیہ بھی کیا، استاذ ہم کو غار کے پاس لے گئے اور بہت سے ایسے آثار اور علامات کی نشاندہی کی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس پر قرآن مجید کا بیان منطبق ہوتا ہے، میں نے وعدہ کیا کہ میں اپنی کتاب پر نظر ثانی کروں گا، اور استاذ کی وسیع معلومات اور علمی تحقیقات سے استفادہ کرنے کی کوشش کروں گا، حق پر کسی کی اجارہ داری نہیں، علم میں ترقی اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

"کہف الرجیب" عمان کے جنوب مشرق میں ۸ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، استاذ نے بتایا کہ یہی رائے مقدسی، یاقوت، سائح ہروی اور بیرونی وغیرہ کی بھی ہے، واللہ اعلم، بلاشبہ استاذ ملک کی بیش بہا علمی سرمایہ ہیں جس کی قدر کرنی چاہیئے اور اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کو مفید بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

دوپہر کا کھانا زرقا میں شیخ عبدالباقی جمو کے دولت کدہ پر کھایا گیا، موصوف زرقاء کے حلقہ سے پارلیمنٹ کے ممبر ہیں، کھانے پر علماء، عمائدین شہر اور اساتذہ کی خاصی تعداد مدعو تھی۔

ایک اہم مجلس مذاکرہ میں شرکت

آج ایک مجلس مذاکرہ میں شرکت کرنی تھی جس کا اس وفد کی آمد کی تقریب میں

خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا، اور جو غالباً اس دورہ کا حاصل تھا، یہ مجلس ساڑھے پانچ بجے شام کو الکلیۃ العلیۃ الاسلامیۃ کے ہال میں منعقد کی گئی، مجلس میں پروفیسر، تعلیم یافتہ طبقہ اور اسلامی ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات معتد بہ تعداد میں موجود تھے، استاذ محمد ابراہیم شقرہ نے بڑی مہارت اور سلیقہ سے مجلس کی نظامت کے فرائض انجام دیئے، راقم سطور، استاذ احمد محمد جمال اور استاذ کامل الشریف خصوصی مہمان کی حیثیت سے مذاکرہ و مباحثہ میں حصہ لینے والے تھے، مجلس کا موضوع تھا "موجودہ معاشرہ میں مسلم نوجوانوں کا کردار" ذیل میں ناظم مجلس کے سوالات اور راقم سطور کے جوابات درج کئے جاتے ہیں۔

نوجوانوں کی بے چینی کے اسباب اور اس کا علاج

سب سے پہلے استاذ محمد ابراہیم شقرہ نے افتتاحی تقریر کی، تقریر میں نوجوانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کی بے چینی پر روشنی ڈالی گئی تھی، پورے عالم اسلام میں جو طاقتیں اور جو نظریات آج کام کر رہے ہیں ان کا بہت مکمل، مفصل اور ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد استاذ نے پہلا سوال کرتے ہوئے کہا:

"استاذنا! آج پورا عالم اسلام عقیدہ، فکر اور عمل غرض ہر سطح پر ایک تباہ کن اضطراب، الجھن اور بے چینی میں گرفتار ہے، یہ بے چینی ہمارے ملک کے مسلم نوجوانوں میں خصوصاً نمایاں طور پر پائی جاتی ہے تو سب سے پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ اسباب کیا ہیں جن سے یہ بے چینی پیدا ہوئی ہے یا جن کی وجہ سے یہ باقی ہے"؟

میرا ریکارڈ شدہ جواب (قدرے ترمیم و اضافہ کے بعد) حسب ذیل تھا:-

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس علمی مذاکرہ میں مجھ پر اعتماد کیا اور مجھ سے اور میرے رفقاء سے اس سوال کا جواب طلب کیا ہے، جو حالات سے گہرا تعلق رکھتا ہے، اور جس صورت حال سے ہم گزر رہے ہیں، اس کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

حضرات! میں آپ سے بہت صفائی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مجھے بہت تعجب ہوتا، اگر مسلم نوجوان اس بے چینی کا شکار اور اس اضطراب سے دوچار نہ ہوتے جیسا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور محسوس کر رہے ہیں، درخت اگر اپنا پھل دیتا ہے تو وہ قابل ملامت نہیں ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ باغبان کوئی پودہ نہ لگائے، لیکن اگر وہ ایک پودہ لگاتا ہے، اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، وقت پر اس کو پانی دیتا ہے، اس کی حفاظت اور نگرانی کے لئے مسلسل رات رات بھر جاگتا ہے، اور چلچلاتی دھوپ اور کڑاکے کی سردی کسی چیز کی پروا نہیں کرتا، اس امید میں کہ یہ درخت پروان چڑھے گا، توانا اور تناور ہو کر پھل دے گا ــــ تو یہ نہایت غیر معقول اور غیر فطری بات ہوگی کہ جب وہ درخت اپنا قدرتی پھل دینے لگے تو باغبان درخت کو ملامت کرے، خفا ہو اور اس کے پھل کو ناپسند کرے اور اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھے، اس لئے کہ جب سے کائنات وجود میں آئی ہے، اور جب سے وہ درخت وجود میں آیا ہے، اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، زیتون کا درخت زیتون کا پھل اور انار کا درخت انار ہی کا پھل دے گا۔

اس الجھن کا جس سے دنیا کے نوجوان خصوصاً مسلم نوجوان دوچار ہیں، سب سے اہم سبب تعلیم، تربیت اور اطلاعات و نشریات کا تضاد ہے، ان کے موروثی خیالات کچھ ہیں، ماحول کے تقاضے کچھ ہیں، اور علمار دین کے مطالبے کچھ ہیں، اس الجھن اور تباہ کن الجھن کا بنیادی سبب یہی عجیب و غریب تضاد ہے، جو نوجوانوں پر مسلط کر دیا گیا ہے، اور اس نے ان کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے ـــ ہوتا یہ ہے کہ بچہ ایک مسلمان خاندان اور مسلمان گھر میں پیدا ہوتا ہے جس کی بنا پر بہت سے اسلامی عقائد سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متأثر ہوتا ہے، پھر ایک مذہبی اور باشعور ماحول ـــ جو اسلام کے اصولوں پر یقین رکھتا ہے ـ میں پروان چڑھتا ہے اور اگر اللہ تعالےٰ نے اسلامی تاریخ پڑھنے کی توفیق دی تو اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اور پھر اس کو جدید تعلیم گاہوں کی طرف ہانک دیا جاتا ہے (اس لفظ کے استعمال پر معذرت چاہوں گا، اس لئے کہ بچہ ابھی کمسن ہوتا ہے، اور اس کو کوئی اختیار نہیں ہوتا) جہاں وہ اپنے اساتذہ سے ـــ جن کی وہ تعظیم اور احترام کرتا ہے اس لئے کہ وہ بہت سے فنون میں ماہر اور صاحب اختصاص ہوتے ہیں ـــ ایسی باتیں سنتا ہے، جو ان افکار و خیالات کے بالکل خلاف ہوتی ہیں، جو گزشتہ اسلامی تربیت کی وجہ سے اس کے ذہن و دماغ میں بیٹھ گئے تھے، ہر طرف وہ ایسی چیزیں دیکھتا اور سنتا ہے، جو گزشتہ تمام چیزوں کی نفی کرتی یا کم سے کم ان کی تحقیر کرتی ہیں، اب وہ ایک عجیب تضاد اور شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور یہ ذہنی کشمکش

سائے کی طرح اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی، یہاں تک کہ کوئی معجزہ رونما ہو جائے
واقعہ یہ ہے کہ جس ماحول میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس ذہنی کشمکش سے
نجات کسی معجزہ سے کم نہیں ہوگی، یہ نازک ترین اور مشکل ترین قسم کی کشمکش
ہے متضاد قوتوں کے درمیان کشمکش، میدان جنگ میں بھی کشمکش ہوتی ہے
مگر جنگ کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مختصر ہوا کرتی ہے، لیکن اس کشمکش سے
تو انسان ہر وقت دوچار رہتا ہے، خواہ مسجد ہو، خواہ مدرسہ، گھر ہو یا بازار
یہاں تک کہ اپنے اور اپنے نفس کے درمیان بھی اس کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔

اس تلخ، خوفناک، ہلاکت آفریں اور گہری کشمکش کا سرچشمہ اطلاعات و
نشریات اور صحافت (وسیع مفہوم میں) کے ادارے اور ٹیلیویژن ہوتے ہیں،
ہمارے نوجوان ہر وقت ایسے پروگرام سنتے اور دیکھتے ہیں، جو ان کی قدیم
تربیت کے باقی ماندہ اثرات کو بھی ختم کر دیتے ہیں، ان کے دماغوں میں
ذہنی بغاوت اور نفسیاتی الجھنوں کو جنم دیتے ہیں، پریس یا جرنلزم جو بہت سے
لوگوں کی نگاہ میں (HIS MAJESTY) سے کم نہیں ہے، ہمارے نوجوانوں
کو صبح سویرے نہار منہ اور قبل اس کے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کریں،
فاسد اور متعفن غذا دیتا ہے، اور ان کے سامنے جذبات کو برانگیختہ کرنے والا
مواد پیش کرتا ہے، سب سے پہلی چیز جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے، وہ کسی
عورت کی برہنہ تصویر، فحش عنوانات یا ایسے مضامین اور تبصرے ہوتے ہیں،
جو ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں، اور ایمان و اعتماد کی بنیادوں
کو متزلزل کرتے ہیں، ہمارے نوجوان ان چیزوں کو پورے ذوق و شوق اور

دلچسپی وانہماک سے پڑھتے اور ان سے متأثر ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں ایسی علمی کتابیں آتی ہیں جو مرعوب کن عنوانوں کی حامل ہوتی ہیں، اور جو ایسے مصنفین کا نتیجۂ فکر ہوتی ہیں، جن کی ذہانت، عبقریت اور کمال پر ہمارے نوجوانوں کا ایمان ہوتا ہے، یہ کتابیں مفسد اور مشکک مواد سے پر ہوتی ہیں، جو مذہب کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں، اسلامی تاریخ کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں، اسلامی شریعت کے مآخذ یہاں تک کہ زبان وادب کے اولین سرچشموں کو مشکوک قرار دیتی ہیں، اس امت کی صلاحیتوں اور اس کے ابدی پیغام کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں، اور عربی زبان کی صلاحیت کو مشکوک قرار دیتی ہیں، علمی نظریات اور ذہن و دماغ کو ماؤف کرنے اور تہذیب واخلاق کو بگاڑنے والے افکار و خیالات کا یہ عجیب و غریب معجون مرکب جب ہمارے نوجوانوں کے دماغوں میں اترتا ہے تو سخت بے چینی اور پریشان کن الجھن کو جنم دیتا ہے، یہ معجون مرکب تو ایسا ہے کہ بڑے سے بڑے پختہ ذہن، آزمودہ کار اور بالغ نظر شخص کو الجھن میں مبتلا کر دے تو ہمارے نرم و نازک نوجوان، یہ نرم و نازک شگوفے جو ابھی کھلے نہیں ہیں کس طرح اس کو ہضم کر جائیں گے، ان سے کیونکر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ان سخت تھپیڑوں کے سامنے ٹکے رہیں گے۔

حضرات! یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی گاڑی یا سواری ہو، اور اس کے آگے بھی ایک گھوڑا ہو اور پیچھے بھی اور دونوں اپنی اپنی سمت گاڑی کو کھینچ رہے ہوں، تو جس طرح اس گاڑی کے سوار سخت کشمکش اور الجھن میں

مبتلا ہوں گے، اسی طرح ہمارے نوجوان ایک جھولے میں دائیں بائیں
جھول رہے ہیں۔

عرب دارالحکومتوں سے جن کو فکری اور مذہبی قیادت حاصل تھی کم سے کم
پچاس سال سے جو ادبی سرمایہ ہمارے سامنے آرہا ہے، اس نے نونہالوں،
نوجوانوں بلکہ بعض سن رسیدہ لوگوں کے دلوں میں بھی شک و اضطراب کے
بیج بوئے، ان کو بعض اوقات اپنے وجود پر بھی شک ہونے لگا، اور وہ
تمام چیزیں جو شہرت و تواتر سے آگے بڑھ کر بدیہیات تک پہنچ گئی ہیں،
مشکوک نظر آنے لگیں، ان کتابوں نے جن کے پیچھے دولت، شہرت، فکری فساد
یا نعروں اور تالیوں کی گونج جیسے سستے مقاصد کارفرما تھے، ہمارے نوجوانوں
کے دلوں اور دماغوں میں شک و ارتیاب، الجھن، کشمکش اور تضاد کی تخم ریزی
کی، چنانچہ مجھے موجودہ صورت حال پر کوئی حیرت اور تعجب نہیں ہے، اور
یہی نوجوانوں کی الجھن اور بے چینی کا بنیادی سبب ہے۔"

پھر استاذ نے دوسرا سوال اٹھایا "نوجوانوں کی اس بے چینی کا ۔۔۔ علاج کیا
ہے؟ میرا جواب حسب ذیل تھا:

"میرے نزدیک نوجوانوں کو اس مہلک الجھن سے نجات دلانے کے لئے
پہلا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ نظام تعلیم کی دوئی ختم کر دی جائے، آپ کے سامنے
اس نکتہ کی وضاحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت تعلیم دو بلاکوں
میں تقسیم ہے، مذہبی بلاک اور غیر مذہبی اور سیکولر بلاک یا قدیم بلاک اور جدید
بلاک، نظام تعلیم کی یہی ثنویت یا دوئی نوجوانوں کی موجودہ الجھنوں کا

اہم ترین سبب ہے، اس لئے اگر ان الجھنوں کو دور کرنا ہے تو سب سے پہلے مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جیسا کہ میں نے کہا خود تعلیمی مواد میں تضاد پایا جاتا ہے، ایک تعلیم جس چیز کو ثابت کرتی ہے، دوسری اس کی نفی کر دیتی ہے، اسی طرح ان علوم کا بھی جو بظاہر عقائد سے تعلق نہیں رکھتے ـــ عقائد سے بہت گہرا تعلق ہے، تعلیم مجرد اور معروضی نہیں رہی، تعلیم کے غیر جانبدار، بے رنگ اور عقائد پر اثر انداز نہ ہونے کا نظریہ بہت پرانا اور کب کا مسترد اور (OUT OF DATE) ہو چکا، اب اس نظریہ میں ذرہ برابر بھی صحت اور واقعیت باقی نہیں رہی، پس پہلا انقلابی اور بنیادی قدم یہی ہے کہ نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جائے، نہ کوئی قدیم ہے نہ جدید، نہ کوئی مذہبی ہے (لاہوتی اور یورپین عیسائی کہنوتی مفہوم میں نہ کہ صحیح اسلامی مفہوم میں) کوئی تعلیم نہ لاہوتی ہے نہ دنیوی نہ عصری نہ سیکولر، تعلیم ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے، اگر کوئی تقسیم ہو سکتی ہے، تو مقاصد اور وسائل کی تقسیم ہوگی، اور ان وسائل کے اندر بھی ایک وحدت ضروری ہے، جو ان کو باہم متحد اور بنیادی نصب العین کا پابند بنا سکے۔

پھر اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی جائے جس کو شریعت اور قرآن کی زبان میں "نفاق" کہتے ہیں، ہم آہنگی سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ایک ملک اور دوسرے ملک کے نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جائے، بلکہ ایک ہی ملک کے نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے، بلاشبہ اس کے لئے

پورے نظام تعلیم کو از سر نو ترتیب دینا ہوگا، اور ایسا نظام تعلیم وضع کرنا ہوگا، جو ایک مکمل، مرتب اور باہم پوری طرح سے ہم آہنگ اکائی ہو گا، اس کے لئے ایک زبردست انقلاب لانے کی ضرورت ہے، ایسا انقلاب جو جرأتمندانہ، وسیع وعمیق اور ہمہ گیر انقلاب ہو، اور پھر قدرتی طور پہ ایسے پختہ فکر اور بالغ نظر افراد کی ضرورت ہوگی جو صرف یورپ کے خوشہ چیں نہ ہوں، نصاب تعلیم میں اجتہاد سے کام لینے کی ضرورت ہے اس کے لئے قدرتی طور پہ زبردست منصوبے تیار کرنے ہوں گے، وسیع اور ہمہ گیر سطح پر جد وجہد کرنی ہوگی، اور اسلامی حکومتوں اور اہم اسلامی اکیڈمیوں کو ان اصولوں کی سرپرستی کرنی ہوگی، اگر ہم نظام تعلیم کو بدلنے میں کامیاب ہوگئے، اور اگر ہم نے اپنے معاشرہ سے یہ تضاد ختم کر دیا تو مجھے پوری امید ہے کہ ہمارے نوجوان اس ہلاکت آفریں کشمکش اور الجھن سے نجات پا جائیں گے؟

پھر استاذ نے تیسرا سوال اٹھاتے ہوئے کہا:۔

"اب استاذ نا ابو الحسن اس کی وضاحت کریں گے کہ ان اداروں کے درمیان صحیح ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے حکومت کا کیا مثبت رول ہونا چاہیئے؟"

میرا جواب یہ تھا:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ہلاکت آفریں عوامل کو دور کرنے اور معاشرہ کو پرامن اور پرسکون زندگی عطا کرنے کے سلسلہ میں حکومت کا کردار بہت اہم اور فیصلہ کن ہوتا ہے، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب حکومت کے پاس کوئی واضح فکر ہو ــــ میں یہاں کسی مخصوص حکومت کا تذکرہ نہیں کر رہا ہوں

نہ کسی پر تعریض مقصود ہے، میں ایک علمی موضوع پر گفتگو کر رہا ہوں ــــــ

اس مذہب کے بارے میں واضح فکر ہو جس پر اس کا ایمان ہے، ان مقاصد کے بارے میں واضح فکر ہو جن کو حکومت نے اپنا نصب العین بنایا ہے، اور وہ چاہتی ہے کہ یہ مقاصد زندہ رہیں، نہ صرف زندہ رہیں بلکہ پھلیں پھولیں اسی کو ہم اسلام کی دینی زبان میں ایمان اور عقیدہ سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں حکومت کا ضمیر منزلزل ایمان اور پختہ عقیدہ ہونا چاہیئے، اسلام کی برتری پر، ان اعلیٰ مقاصد کی برتری پر جن کی وہ دعوت دیتی ہے، اور جن کے لئے وہ زندہ ہے، اسے جبایت[1] (تحصیل وصولی) کے بجائے ہدایت کے اصول پر کاربند ہونا چاہیئے۔

پھر اخلاص، اولوالعزمی اور جاں نثاری کا جذبہ ہونا چاہیئے، یہی تمام عوامل اسلامی شخصیت کی نشو و نما، ارتقا، تکمیل اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے مناسب فضا اور مناسب ماحول پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔"

آخری سوال پیش کرتے ہوئے استاذ محمد ابراہیم شقرہ نے کہا:

"آخر میں میں استاذ ابوالحسن سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے تجربوں کی روشنی میں ـــ جن سے وہ اپنی جوانی اور کہولت کے دور میں گزرے ہیں، اور اس وقت بڑھاپے کے

---

[1] اس اصول کی بہترین نمائندگی سیدنا عمر بن عبدالعزیز کا وہ تاریخی جملہ کرتا ہے، جو انھوں نے اپنے ایک عامل کی اس شکایت پر فرمایا تھا کہ اسلام پھیل جانے کی وجہ سے جزیہ میں کمی ہوگئی ہے، آپ نے فرمایا: برا ہو تمہارا! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، محصل نہیں بنا کر بھیجے گئے تھے۔"

دور میں داخل ہو چکے ہیں ــــ اس آخری تجویز پر تبصرہ کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ آخر میں نوجوانوں کو اپنے قیمتی مشوروں اور نصیحتوں سے نوازیں گے، اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ استاذ کا سایہ تا دیر ہم پر قائم رکھے۔"

میں نے کہا:۔

"میں نوجوانوں کی صلاحیت اور ان کے کردار سے مایوس نہیں ہوں، مجھے یقین ہے کہ ہمارے نوجوان اسلامی دعوت اور اسلامی فکر کے میدان میں کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اس فکری رزمگاہ میں جس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ قاصر ہے، وہ بحیثیت مسلم نوجوان کے اپنا رول ادا کرنا چاہتے ہیں۔

حضرات! نوجوانوں میں مختلف طبقے اور درجے ہیں، ان کی کوئی ایک قسم نہیں ہے، ہم نے بہت سے ایسے نوجوان دیکھے ہیں، جو اپنا رول ادا کرنے کے لئے بے قرار ہیں، ان کے اندر اس کی مکمل صلاحیت بھی موجود ہے موجودہ صورت حال سے ان کو سخت دکھ اور تکلیف ہے، یہی نوجوان حال کا سرمایہ اور مستقبل کی امید ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہی نوجوان موجودہ فکری دھارے کا رخ موڑ سکتے ہیں، میں اپنی معلومات کی بنیاد پر پورے یقین کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ نوجوانوں میں اسلامی دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے میدان موجود ہے، ان کے اندر بے چینی پائی جاتی ہے، یہی بے چینی ترقی اور بہتری کی طرف پہلا قدم ہے، نوجوان آج پریشان ہیں بے چین ہیں، مغربی تہذیب ان کو مطمئن کرنے میں ناکام ہو گئی، نوجوانوں کی زندگی میں ایک خلا پایا جاتا ہے، جو نہ پُر ہوا ہے نہ پُر ہو سکتا ہے، جیسا کہ استاذ کامل الشریف نے فرمایا۔

صرف ایک ہی مذہب اس ہولناک خلا کو پر کرسکتا ہے، جو یورپ نے قلب و روح اور جسم و مادہ کے درمیان پیدا کر دیا ہے، یہ مغربی تہذیب کی مخصوص چیز تھی، جو اپنے طویل سفر میں مخصوص مراحل اور مخصوص تجربوں سے گزری، لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے، اور اسے انسانیت کی بدقسمتی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ جب یورپ کو فکری قیادت حاصل ہوئی تو اس کے تجربوں نے ان قوموں کے ذہن پر بھی اثر ڈالا جن کا ان تجربوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا، یہ ایک مخصوص معاشرہ کے تجربے تھے، جس کے مذہب کا ایک خاص مزاج تھا، اس معاشرہ میں کلیسا اور حکومت کے درمیان کشمکش ہوئی، مذہب اور تعلیم کے درمیان کشمکش ہوئی، کہنوت، عقل سلیم اور موجودہ سائنس کے درمیان کشمکش ہوئی، یہ تمام تجربے یورپ کے اپنے مخصوص تجربے تھے، مشرق ان سے بالکل بے نیاز اور ناآشنا تھا، لیکن یورپ نے اور مغربی تہذیب نے یہ تجربے، ان تجربوں کے اثرات، ان تجربوں کے نتائج اور ان تجربوں کی قدر و قیمت ہر چیز کو مشرقی قوموں پر مسلط کر دیا، "مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے" "مذہب و سیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں" اور اس طرح کے دوسرے نظریات مغربی قوموں کے تجربات تھے، جو مخصوص حالات، مخصوص ماحول اور مغرب کے مذہب یعنی عیسائیت کے مخصوص مزاج کی پیداوار تھے، لیکن مشرقی قوموں نے بغیر کسی سبب اور وجہ جواز کے ان تجربات کو قبول کر لیا، چنانچہ یہ خلا نوجوانوں میں پایا جاتا ہے، اور ان کو اس خلا کا احساس بھی ہو چلا ہے، آج ہم کو نوجوانوں کی زندگی میں جو بے راہ روی، بے اعتدالی

اور انتہا پسندی نظر آرہی ہے۔ وہ اسی احساس کا نتیجہ ہے، میں ایشیا اور مشرق میں اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ نوجوانوں کے اندر اس نئی تحریک کی قیادت اور اس فکری معرکہ میں کودنے کی پوری صلاحیت اور قابلیت موجود ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے اور نوجوانوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے، ہم ان سے بے تعلق رہتے ہیں، ہمارے اندر ان کی طرف سے بہت غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پائی جاتی ہیں، ہم اس صورتحال سے بالکل ناواقف ہیں جس سے آج کا نوجوان گزر رہا ہے، اگر بوڑھوں اور نوجوانوں، مبلغین اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے ختم ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے نوجوان اس دعوت سے متاثر، اس کے مقاصد سے مطمئن اور اس کو فروغ دینے کے لئے سرگرم عمل نہ ہوں، لیکن اس کے لئے بہت نازک، گہری اور باریک علمی منصوبہ بندیوں کی ضرورت ہے، ایک نئے لٹریچر کی ضرورت ہے، نوجوانوں سے گفتگو کرنے کے لئے ایک نئے اسلوب اور طرز بیان کی ضرورت ہے، اس حکمت کی ضرورت ہے جس کی جانب قرآن نے اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا ہے:

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم	اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے اور
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط	(اگر بحث آن پڑے تو) ان کے ساتھ
(سورۃ النحل — ۱۲۵)	اچھے طریقے سے بحث کیجئے (کہ اس میں
	شدت و خشونت نہ ہو)

اس کے لیے طاقتور، فکر انگیز و گوہر بار قلم کی ضرورت ہے، مافی الضمیر کی ادائیگی پر غیر معمولی قدرت، ادبی چاشنی، شیرینی گفتار، اور اس پرکشش سحر انگیز اور دلآویز انداز بیان کی ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی دعوت نوجوانوں کے دلوں میں گھر نہیں کر سکتی، اور ان کے ذہن و دماغ کو متاثر نہیں کر سکتی۔

ہمیں سخت افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض محترم اور فاضل علماء زبان و ادب پر عبور حاصل کرنے اور زور بیان اور بلیغ اور دل نشین اسلوب پیدا کرنے کو فضول، غیر ضروری اور بالکل ضمنی چیز سمجھتے ہیں، ان چیزوں کو ہمارے علماء اپنے فرائض سے علیحدہ اور اپنے راستہ سے انحراف سمجھتے ہیں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے خود اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے اور ہم سب کا اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی کتاب کو ایک معجز اسلوب اور عربی مبین میں نازل فرمایا، اور یہی نہیں بلکہ اس پہلو کو ایک سے زیادہ جگہوں پر اجاگر بھی کیا، ارشاد ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ	اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے
قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝	آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝	تاکہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں
(الشعراء ۔ ۱۹۳۔۱۹۵)	کے ہوں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ	ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا
تَعْقِلُونَ ۝ (یوسف ۔ ۲)	تاکہ تم (لوجہ اہل زبان ہونے کے اولاً) سمجھو

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان، اسلوب اور بلاغت کا پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے، اور جب ہم دعوت و عزیمت اور تجدید و احیائے دین کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ بزرگ و برگزیدہ شخصیات جو اخلاص، انقطاع الی اللہ اور ربانیت صادقہ کے نقطۂ عروج پر تھیں انھوں نے کبھی اس پہلو کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس کی طرف پوری توجہ کی اور اس پر پورا زور دیا، ہم اس موقع پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مثال تو نہیں پیش کرنا چاہتے کیونکہ آپ بالاتفاق اور بغیر کسی شک وشبہ کے فصیح ترین اور بلیغ ترین انسان تھے، البتہ ہم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مثال پیش کرتے ہیں، جو بلاغت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اور اسی طرح تاریخ اسلام کی آخری صدیوں تک نظر دوڑاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جن شخصیات کو بھی اسلامی دعوت و تحریک میں قیادت کا منصب حاصل رہا ہے، انھیں اللہ تعالےٰ نے زور بیان، مخاطب کی نفسیات کی فہم اور فصاحت و بلاغت کا بہرۂ وافر عطا کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ جب میں سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات پڑھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں، وہ شخص جو ساری دنیا میں اور ہر دور میں اپنے زہد، قناعت، ربانیت اور تقویٰ کے لئے مشہور رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام کے دارالحکومت اور عباسی خلافت کے مرکز بغداد میں جہاں حریری، ابن الجوزی اور صابی پیدا ہوئے، جہاں بحتری، شریف رضی، متنبی، ابو تمام اور مہیار نے نغمہ سنجیاں کیں، وہی شخص اپنے اس معاشرہ کو ایک سحر انگیز انداز بیان میں مخاطب کرتا ہے، ایسے انداز بیان میں جو دلوں کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور جس کی تاثیر اور طاقت

آج بھی موجود ہے، اسی تاثیر کے پیش نظر حضرت جیلانی کے خطبات کو جمع کرنے والوں نے کوشش کی ہے کہ بعینہ ان کے الفاظ بھی ہوں، ورنہ اگر معنوی روایت ہوتی تو یہ خطبے اپنی تاثیر بڑی حد تک کھو دیتے۔

ان سب باتوں سے ادب اور اسلوب کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اگر ہم نوجوانوں کی صحیح اور گہری اسلامی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہم کو نئے علمی وادبی اسلحہ سے مسلح ہونا پڑے گا، تیاری کرنی ہوگی، ان تمام شرطوں کو پورا کرنا ہوگا، جو ہر زمان ومکان کے لئے ہیں، اور جو آج بھی اپنی قیمت اہمیت اور اثر رکھتی ہیں، یعنی ایک ایسا علمی اور اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہوگا، جو نوجوانوں کے ذہن سے قریب ہو، جوان کو اپیل کرے، جسے نوجوانوں میں مقبولیت حاصل ہو بلکہ وہ اس کو پڑھنے کے لئے بیتاب اور بے قرار ہوں، اگر ہم نے یہ شرطیں پوری کرلیں تو مجھے یقین ہے کہ نوجوان صرف یہی نہیں کہ اس نظریہ پر ایمان لائیں گے بلکہ اس کو عام کرنے کی ہر ممکن جد وجہد کریں گے اور اس کے لئے جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔"

شام کو وفد نے ایک عشائیہ میں شرکت کی جو عمان میں سعودی قائمقام سفیر (چارج ڈی افیرس) استاذ محمد سمیش نے وفد کے اعزاز میں دیا تھا، اس عشائیہ میں علماء عمائدین شہر اور سیاسی حلقہ کے لوگ بڑی تعداد میں شریک تھے۔

عمان سے کرک

اتوار ۱۹ راگست ۷۳ء کا دن، دوروں، ملاقاتوں اور تاریخی مشاہدات کے

اعتبار سے اردن کے سفر کا مشغول ترین دن تھا۔

صبح ساڑھے ۶ بجے ہم کرک کے لئے روانہ ہوئے وزارت اوقاف کے سکریٹری استاذ عبد خلف ہمارے ساتھ تھے، وہ تاریخی آثار مقامات کے سلسلہ میں بہت معلومات رکھتے ہیں، سیرت وتاریخ کا وسیع مطالعہ ہے، ان مقامات پر اکثر جاتے رہتے ہیں اسلئے ان کی بستی ان مقامات کے قریب ہی میں ہے، آثار قدیمہ کے مشہور ماہر استاذ رفیق وفا دجانی جن کا نام "کہف" کے دورہ میں گزر چکا ہے ۔ کی رفاقت سے اس دورہ کی علمی اور تاریخی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا، تفریح کے ساتھ ساتھ تحقیق اور عبرت پذیری کے مواقع بھی ملے، اور ان بہت سی چیزوں کی وضاحت ہوئی، جو ہم نے سیرت وتاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھی تھیں، اور جن کی حقیقت تک پہنچنا صاحب اختصاص حضرات کی رہنمائی میں ان مقامات کو آنکھوں سے دیکھے بغیر ممکن نہیں تھا، پچاس کتابیں پڑھنے سے بھی اتنی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں، جو اس مختصر دورہ میں حاصل ہو گئیں، مزید برآں ان مقامات کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد دل میں جو اثر ہوتا ہے، اور جو احساسات ابھرتے ہیں، وہ ان کے بارے میں کسی کتاب کے مطالعہ سے نہیں ابھر سکتے، پرانی مثل ہے،

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

فوج کے سامنے تقریر

سب سے پہلے ہم ایک اسلامی حکومت کی مسلح فوجوں کے ایک مرکز کو دیکھنے گئے عمان میں جب ہم تھے، اسی وقت ہم سے اس چھاؤنی کو دیکھنے اور ایک اہم اور نازک سرحد پر تعینات فوجیوں سے خطاب کرنے کی فرمائش کی گئی تھی، اور ہم نے اس علاقہ کے رہنمائی

اعتماد اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا تھا، یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ میں ایک عظیم اسلامی سلطنت کی مسلح فوجوں سے ملاقات اور ان سرفروش مجاہدین سے خطاب کر رہا تھا جنھوں نے اپنی زندگی، اسلام اور اسلامی مملکت کے دفاع، اسلامی مقدسات کے تحفظ اور اپنی جانب سے ہر آنے والے خطرہ کے مقابلہ کے لئے وقف کر دی ہے۔

جب مسلح نوجوان صف بستہ کھڑے ہوئے اور اسلامی طریقہ کے مطابق ہم کو سلامی دی — اور یہ منظر میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا — تو میرے جسم میں عزم و ایمان اور سرخوشی و سرشاری کی ایک لہر دوڑ گئی، اور طرب و اہتزاز کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی، اس کیفیت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میری طبیعت رواں ہو گئی، اور زبان ذہن سے پہلے زبانِ دل سے گفتگو شروع کرتے ہوئے میں نے کہا:-

"میرا نشو و نما ایک علمی اور دینی ماحول میں ہوا ہے، مجھے صاحب فکر، صاحب علم اور اہل قلم حضرات کی صحبت سے فیضیاب ہونے اور بے شمار ایسے اجتماعات اور مجالس میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہے، جن میں علماء اور مفکرین کی کثرت ہوتی تھی، اور جن میں بہت سی یکتائے روزگار شخصیات جلوہ افروز ہوتی تھیں، لیکن آج جو سرشاری، جو مسرت، جو خشوع اور جو سعادت و لذت محسوس کر رہا ہوں، وہ زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی — اگر میرے بس میں ہوتا — اور اس کی اجازت ہوتی، تو میں آپ میں سے ہر فوجی کی دست بوسی کی کوشش کرتا کیونکہ آپ کا ہاتھ اسلام کے لئے برسرپیکار رہے، آپ کا ہاتھ اس لئے ہتھیار پکڑتا ہے کہ اسلام اور

مسلمانوں کی مدافعت کرے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ	برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر
الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ	کے گھر میں بیٹھے رہیں اور وہ لوگ جو
وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فَضَّلَ	سے جہاد کریں اللہ تعالےٰ نے ان
اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ	لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے
وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ	جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد
دَرَجَةً (النساء ــ ۹۵)	کرتے ہیں بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے

آپ اسلامی ممالک کے پاسبان ہیں مسلمان عورتوں اور بچوں کی عزت و آبرو کے نگہبان ہیں، ان مسجدوں کے تقدس اور ان دینی اداروں اور تعلیم گاہوں کے سکون کے محافظ ہیں، جہاں اللہ تعالےٰ کی عبادت ہوتی ہے، اللہ تعالےٰ کا ذکر ہوتا ہے، اسلام کی تبلیغ ہوتی ہے، علم کی اشاعت ہوتی ہے، فرائض و سنن کی تعلیم ہوتی ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاح احوال ہوتی ہے ـــ اسلامی سرحدوں کے پاسبانو! اور نگہبانو! اگر آپ نہ ہوتے، آپ کی جانبازی اور سرفروشی نہ ہوتی، اور آپ کی شجاعت و جوانمردی نہ ہوتی، تو موذنوں کے لئے اذان کی آواز بلند کرنا ناممکن ہو جاتا، نمازیوں کے لئے خدا کے گھر میں فرض کی ادائیگی مشکل ہو جاتی، علم کی اشاعت اور اس امانت کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا کوئی مرکز نہ ہوتا، بوڑھوں، عورتوں اور کمزوروں پر سکون کی نیند حرام ہو جاتی، تاجروں کو اپنی تجارت اور

پیشہ وروں کو اپنے پیشوں سے اشتغال دشوار ہو جاتا، ہر مذہبی شعار، ہر علمی مصروفیت اور زندگی کے ہر عمل پر آپ کا احسان ہے، خواہ کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے، اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے :۔

عینان لا تمسھما النار، عین بکت من خشیۃ اللہ و عین باتت تحرس فی سبیل اللہ۔[1]	دو آنکھوں تک جہنم کی لپٹ نہیں پہنچ سکے گی ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی، اور ایک وہ آنکھ جو رات بھر اللہ کی راہ میں پہرہ دیتی رہی

دوسری حدیث میں ہے :۔

ما اغبرت قدما عبد فی سبیل اللہ فتمسہ النار۔[2]	جو قدم بھی اللہ کی راہ میں گرد آلود ہوئے ان کے لئے آگ حرام ہو گئی۔

ایک اور حدیث میں نبی کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا و ما علیھا۔[3]	اللہ کے راستہ میں ایک دن کا پہرہ اور سرحد کی حفاظت دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے

ایک روایت میں ہے :۔

غدوۃ فی سبیل اللہ او روحۃ خیر من الدنیا و ما فیھا۔[4]	اللہ کے راستہ میں ایک صبح کا نکلنا یا ایک شام کا نکلنا دنیا و ما فیہا سے اعلیٰ و افضل ہے۔

---

[1] ترمذی عن ابن عباس مرفوعاً۔ [2] بخاری، ترمذی، نسائی عن ابی عبس مرفوعاً۔

[3] متفق علیہ [4] ایضاً

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد کو اسلام کے کوہان کا بالائی حصہ (سب سے بلند مرتبہ) قرار دیا ہے، چنانچہ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

ألا أدلک برأس الامر وعموده وذروة سنامه؛ قلت: بلی یارسول اللہ! قال: رأس الأمر الاسلام، وعموده الصلوٰة وذروة سنامه الجهاد۔[1]	بھلا میں تم کو اصل الاصول دین کا ستون اور اس کی چوٹی کی چیز بتاؤں میں نے کہا: ضرور ضرور، ارشاد ہو آپ نے فرمایا، اصل الاصول تو اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے، اور اس کی چوٹی کی چیز جہاد ہے

میں نے ان کے سامنے، برصغیر کی تاریخ جہاد سے، تیرھویں صدی ہجری میں توحید و جہاد کے علمبردار اور دعوت و اصلاح کی سب سے بڑی جدوجہد کے قائد حضرت سید احمد شہیدؒ کا ایک واقعہ پیش کیا، کہ ایک بار مجاہدین اپنے امیر حضرت سید احمدؒ کی قیادت میں مایار کے معرکہ سے مظفر و منصور واپس آئے ان کے چہرے غبار آلود اور ان کے کپڑے گرد سے اٹے ہوئے تھے، یہاں تک کہ پہچانے نہیں جاتے تھے، سردار بہرام خاں ۔۔۔۔ ایک رومال لیکر

---

[1] ترمذی، احمد، ابن ماجہ عن معاذ بن جبل مرفوعاً یہ ایک طویل حدیث ہے، حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تقریر میں میں نے ان احادیث کا مفہوم بیان کیا تھا، مگر جب قلمبند کرنا ہوا تو اصول سے مراجعت کر کے اصل احادیث کے الفاظ کو نقل کیا اور اس مفہوم کی بعض اور احادیث کا اضافہ بھی کر دیا۔

امیر کے چہرہ سے گرد جھاڑنے کے لئے کھڑے ہوئے تو حضرت سید احمدؒ نے کہا "پٹھان بھائی ذرا ٹھہر، یہ وہی غبار ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا یجتمع غبار فی سبیل اللہ ودخان جہنم[1]	اللہ کی راہ کا غبار اور جہنم کا دھواں دونوں جمع نہیں ہوں گے۔

ہمارے یہاں آنے اور ان صعوبتوں کو برداشت کرنے کا مقصد یہی یہ تھا کہ اس غبار کو حاصل کریں گے، تو پٹھان بھائی ذرا صبر کرا تنی عجلت کی ضرورت نہیں۔

اور مجاہدین ٹھہر گئے اور اس وقت اس غبار کو نہیں جھاڑا[2]۔

پھر میں نے ان فوجیوں کو دو اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی۔

پہلی بات تو یہ کہ نیت میں خلوص ہو، مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ اور رضائے الہٰی کا حصول ہو اور اس شجاعت وجوانمردی کے پیچھے کوئی اور غرض کار فرما نہ ہو، میں نے ان کے سامنے وہ مشہور حدیث پیش کی جو صحاح میں وارد ہوئی ہے۔

سئل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن الرجل یقاتل شجاعۃ ویقاتل حمیۃ ویقاتل ریاءً ای ذلک فی سبیل اللہ	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری کی وجہ سے جنگ کرتا ہے ایک شخص حمیت وغیرت میں آکر جنگ کرتا ہے

---

[1] سنن [2] سیرت سید احمد شہیدؒ جلد دوم (لاہور ایڈیشن)

فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللّٰہ[1]	ایک شخص دکھاوے کے لئے جنگ کرتا ہے تو ان میں سے کون اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والا شمار ہوگا؟ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو صرف اس لئے جنگ کرے کہ اللہ کا بول بالا ہو وہی اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والا شمار ہوگا۔

دوسری چیز جس کی طرف میں نے توجہ دلائی وہ معاصی اور ہر ایسی چیز سے اجتناب جو اللہ تعالٰے کے غضب کا باعث اور نصرت الٰہی کے تقاضوں کے خلاف ہو سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ایک خط لکھا تھا جس میں فرمایا تھا کہ "وہ دشمن کی قوت وکثرت اور اسلحہ سے اتنا نہ ڈرے، جتنا گناہوں اور خدا کی نافرمانی سے ڈرے کیونکہ میرے نزدیک لوگوں کے لئے گناہ دشمن کی چالوں سے زیادہ خطرناک ہیں"[2]

حاضرین پر تقریر کا گہرا اثر ہوا، تقریر ریکارڈ کی گئی، میرا خیال ہے کہ ہر اسلامی ملک میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلح افواج کے اندر دینی شعور پیدا کیا جائے جہاد کا اللہ تعالٰے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جو مرتبہ اور مقام ہے، اور شہادت کی جو فضیلت اور عند اللہ شہدا کا جو ثواب اور اجر ہے اس کو ان کے سامنے اجاگر کیا جائے، اس عظیم اور غیر معمولی طاقت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے اسلام اور

---

[1] متفق علیہ [2] سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن عبدالحکم۔

مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچا ہے، اور اسلامی حکومتوں اور ان کی جنگی اور دفاعی طاقت، اور غیر اسلامی حکومتوں اور ان کی جنگی اور دفاعی طاقت کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہا جبکہ بنیادی اور اسلامی حکومتوں کے درمیان امتیاز یہی تھا کہ مسلمان جب جنگ کرتے ہیں تو اس کے پیچھے ان کا ایمان واحتساب کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، وہ عنداللہ اجر و ثواب کے امیدوار ہوتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالے مؤمنین اولین کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا. (النساء-۱۰۴)

اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو جس طرح تم بے آرام ہوتے ہو، اسی طرح وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں، اور تم خدا سے ایسی ایسی امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھ سکتے، اور خدا سب کچھ جانتا اور بڑی حکمت والا ہے۔

میرے بعد استاذ محمد احمد جمال کی باری آئی استاذ جمال قرآنی آیات کے استحضار و اقتباس میں امتیاز رکھتے ہیں، اور بہت سی احادیث کے متون ان کو زبانی یاد ہیں، چنانچہ انھوں نے جہاد اور شہادت کے بارے میں بہت سی آیات و احادیث سے حسب موقع استشہاد کرتے ہوئے ایک فاضلانہ تقریر کی جس نے حاضرین سے خراج تحسین حاصل کیا، ناشتہ کرنے کے بعد ہم اس فوجی مرکز سے روانہ ہوئے تو ہم ان کی عزت افزائی سے مسرور اور اس اسلامی جذبہ سے سرشار تھے جو اس علاقہ پر اور اس کے باشندوں پر سایہ فگن تھا، اور اپنے فوجی بھائیوں کی تائید غیبی اور نصرت الٰہی کے لئے دل سے دعا کر رہے تھے۔

کچھ دیر شہدا موتہ کے مرقد پر

اور آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ موتہ پہنچے، یہ وہی موتہ ہے جس کی جانب

ایک عظیم اسلامی جنگ منسوب ہے جس کے حالات وواقعات ہم اسلامی سیرت تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، اس معرکہ میں مسلمانوں نے غیر معمولی شجاعت وجوانمردی کا ثبوت دیا تھا، موتہ کرک کے جنوب میں ۱۲ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ایک کشادہ میدان میں واقع ہے، غزوہ موتہ ۸ھ میں پیش آیا تھا[1] اس غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد ۳ ہزار اور رومیوں اور عیسائی عربوں کی مجموعی تعداد تقریباً ۲ لاکھ تھی، حضرت زید بن حارثہؓ اس جگہ کے قریب شہید ہوئے تھے، جو اس وقت مشہد کے نام سے مشہور ہے، حضرت زیدؓ کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے علم اٹھایا، داہنا ہاتھ کٹ کر گرا تو بائیں ہاتھ میں علم لے لیا، وہ بھی کٹ گیا تو دونوں بازوؤں سے اس کو تھام لیا اور برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے، اسی موقعہ پر آپ کو "جعفر طیار" اور "ذوالجناحین" کا لقب ملا، آپ کے بعد حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے علم لیا اور لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے، حضرت عبداللہ بن رواحہ کے بعد مسلمانوں نے بالاتفاق حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو علم دیا، اور آپ غیر معمولی شجاعت اور جانبازی سے لڑتے رہے یہاں تک کہ رات ہو گئی اور رومی شمال کی طرف اور مسلمان جنوب کی طرف چلے گئے۔" دور دونوں فوجوں نے صبح تک کے لئے ہتھیار رکھ دیئے، اس اثناء میں حضرت خالد نے ایک اسکیم تیار کی اور اپنے لشکر کی ایک بڑی تعداد کو اپنی فوج کے پیچھے ایک لمبی لائن پر تعینات کر دیا جس نے صبح ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا کر دیا، دشمن نے سمجھا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تازہ کمک پہنچی ہے، اور جب پہلے روز صرف ۳ ہزار افراد نے رومیوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، اور ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے تھے تو تازہ کمک تو نہ جانے

---

[1] واقعہ کی تفصیلات اور اسباب معلوم کرنے کے لئے دیکھئے سیرت ابن ہشام حصہ سوم ص ۳۷۳-۳۸۹ طبع مصطفی البابی الحلبی مصر، دوسرا ایڈیشن، سیر ومغازی کی دوسری کتابوں میں بھی تفصیل موجود ہے۔

ان کے ساتھ کیا کرے گی جس کی تعداد بھی کسی کو معلوم نہ تھی، یہ سوچ کر رومیوں نے حضرت خالدؓ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی اور ان کو خوشی ہوئی کہ حضرت خالد نے بھی ان پر حملہ نہیں کیا، اس سے زیادہ رومیوں کو اس پر خوشی تھی کہ حضرت خالد اور ان کے ساتھی، مدینہ واپس چلے گئے اور جنگ میں ان کو فتح نہیں حاصل ہو سکی، اگرچہ رومیوں کو بھی فتح نہیں حاصل ہوئی تھی۔[1]

ہم اس جگہ پر کچھ دیر خاموش اور سر جھکائے کھڑے رہے، اور ان جاں بازوں کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی پر محو حیرت تھے، جو مدینہ سے موتہ موآب، کے علاقہ میں آئے تھے، اس علاقہ میں جو دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت کے زیر نگیں تھا، فوج، رسد اور جنگی وسائل کے اعتبار سے یہ سلطنت دنیا کی دوسری تمام حکومتوں پر فوقیت رکھتی تھی، مدینہ اور موتہ کے درمیان تقریباً ۱۱۰۰ کیلو میٹر کا فاصلہ ہے، یہ طویل مسافت اسلام کے مجاہدوں نے اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعہ طے کی، اور مدینہ سے نکلنے کے بعد نہ ان کو کمک ملی نہ رسد اور نہ دارالخلافہ سے ان کا کوئی رابطہ باقی رہ گیا تھا، اور وہ دشمن کے جبڑوں میں داخل ہو رہے تھے، سیرت ابن ہشام میں ہے۔

"پھر وہ آگے بڑھے اور ملک شام میں معان کے مقام پر قیام کیا، وہاں معلوم ہوا کہ ہرقل بلقاء کے علاقہ سے ایک لاکھ رومیوں کو لیکر مآب پہنچ چکا ہے، اور لخم، جذام، قین بحراء اور بلی کے قبائل کے ایک لاکھ افراد بھی اس کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا تو وہ دو دن معان میں ٹھہرے صورت حال پر غور کرتے رہے، اور انھوں نے کہا: رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لکھا جائے، اور آپ کو دشمن کی تعداد کی اطلاع کی جائے تو آپ یا تو کمک روانہ فرمائیں ورنہ جو حکم دیں، اس کے مطابق ہم عمل کریں، اسکے بعد

---

[1] "حیاۃ محمد" از ڈاکٹر محمد حسین ہیکل ص ۳۷۷

حضرت عبداللہ بن رواحہ نے لوگوں کو جوش دلایا آپ نے کہا: لوگو! تم جس سے گھبرا رہے ہو وہی چیز تو ہے، جس کے لئے تم یہاں آئے ہو یعنی شہادت ہم لوگوں سے تعداد کی کثرت اور طاقت کے سہارے جنگ نہیں کرتے ہم تو اس دین کے ذریعہ جنگ کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو نوازا ہے پس چلو، دو نعمتوں میں سے ایک تو ضرور ہی ملے گی، غلبہ یا شہادت، تو لوگوں نے کہا: خدا کی قسم ابن رواحہ نے بالکل صحیح بات کہی، اور لوگ نکل پڑے[1]۔

اور پھر جنگ ہوئی مسلمانوں کے تینوں سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، اسے کہتے ہیں، مومن عقل اور مومنانہ انداز فکر، جو مومنین اولین میں بدرجۂ اتم موجود تھا، اور جس سے بعد کے مسلمان محروم ہو گئے، اسی وجہ سے مسلمانوں کے ماضی اور حال کے درمیان اتنا نمایاں اور واضح فرق ہو گیا ہے۔

ہم نے تینوں سپہ سالاروں کی قبروں کی زیارت کی یہ حضرات اپنی شہادت کے مقام ہی پر مدفون ہیں، سیدنا جعفر بن ابی طالب کی مسجد بھی دیکھی، اور آپ کے مزار پر آپ کی بے نظیر شجاعت کے کارناموں کو یاد کرتے رہے، یہ مسجد اور مزاروں پر بلند گنبدوں کی تعمیر ہاشمی دور میں ہوئی تھی محکمۂ آثار قدیمہ کی جانب سے سیاحوں کو جو پمفلٹ دیئے جاتے ہیں، ان میں ان مزارات کی تاریخ اور ان کے متعلق ساری تفصیلات درج ہوتی ہیں، ان مزارات پر جس وقت ہم فاتحہ پڑھ رہے تھے، اپنا وجود ہم کو بہت حقیر اور بے حیثیت نظر آ رہا تھا۔

موتہ کے تاریخی مقامات

سیدنا حضرت جعفرؓ کی مسجد کے پاس ایک اسلامی میوزیم ہے، جو ابھی تکمیل کے مرحلہ

---

[1] سیرت ابن ہشام حصہ سوم ص ۳۷۵

ہیں اور بالکل ابتدائی حالت میں ہے، اس میں اسلامی آثار و مخطوطات رکھے گئے ہیں، میوزیم کا انتظام وزارت اوقاف کے ذمہ ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میوزیم کی تاریخ پرانی ہے، اور اس کو الملک الناصر محمد بن قلاوون کے عہد میں شوبک اور کرک کے نائب السلطنت بہادر البدر الملکی الناصری نے ۷۲۰ھ میں تعمیر کیا تھا، میوزیم میں استاذ محمود الافغانی وغیرہ کے جمع کئے ہوئے اسلامی آثار بھی ہیں۔

بتراء کا سفر

موتہ سے ہم نے بتراء اور معان کا رخ کیا، راستہ میں "محنظہ" نامی بستی سے گزرے، وہاں کا پانی معدہ کی اصلاح اور ریگ اور پتھری کے امراض کے لئے مشہور سمجھا جاتا ہے، اور دور دور سے لوگ پینے کے لئے آتے ہیں، "ضانہ" نامی بستی سے بھی گزر ہوا، اور کچھ وقت شوبک میں گزارا اور وہاں کا زراعتی اسکول دیکھا اور وادی عربہ سے بھی گزرے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا، اور عصر کی نماز ادا کی اس کے بعد ایک سیاحتی اور تاریخی دورہ کے لئے جانا تھا جس کے لئے چستی اور نشاط کی ضرورت تھی ــــــ اور پھر بتراء[1] کے لئے روانہ ہو گئے، بتراء قدیم تاریخی شہر ہے جس کی تاریخ

---

[1] اردن کے لوگ اسی طرح بولتے ہیں لیکن قدیم مورخین اور جغرافیہ دانوں نے اس کو "بطراء" اور "بطرہ" ضبط کیا ہے، بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہی وہ مقام ہے جس کو عبرانیوں نے "سلع" لکھا ہے، اور جس کا ذکر اشعیا ۱ــ۱۶ اور ملوک ۲ــ۱۴، ۵ــ۷ میں آیا ہے، اور یہی وہ چٹانی عربی قصبہ ہے، جو یونانیوں اور رومیوں کے یہاں بہت مشہور تھا، نبطیوں نے جو عربی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، ہزاروں سال پہلے اس شہر کو قائم کیا تھا، تہذیب و تمدن میں انھوں نے بہت ترقی کر لی تھی، ان میں (باقی صفحہ ۲۷۸ پر)

ہزاروں سال پرانی ہے، عرب نبطیوں نے یہ شہر آباد کیا تھا، حجر اور مدائن صالح کی طرح یہ شہر بھی پہاڑوں کے اندر کھود کر بنایا گیا تھا بعض ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ آثار سنگتراشی، ترتیب تنسیق اور سلیقہ مندی کاریگری کے اعتبار سے ثمود کے آثار سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں،

ہماری کاریں ایک لمبی اور کھلی سرنگ سے ہوتی ہوئی پہاڑ میں تراشے ہوئے ایک راستہ سے گزریں، جو کئی کیلو میٹر لمبا تھا، اور بار بار مڑتا تھا، اور اس کے دونوں طرف دو اونچے پہاڑ تھے، پھر ہم ایک شہر میں داخل ہوئے جس میں تہذیب و تمدن کے تمام مظاہر موجود ہیں محل، ایوان، بازار، عدالت اور پختہ سڑکیں سب پہاڑ کو تراش کر بنائی گئی ہیں، ہماری رہنمائی استاذ رفیق وفا دجانی کر رہے تھے، وہ ان تمام آثار ان کی تعمیر اور ان کے مقاصد کی وضاحت کرتے جاتے تھے، اگر وہ نہ ہوتے تو ہمارے لئے یہ تاریخی دورہ کچھ زیادہ مفید نہ ثابت ہوتا اور اس سے زیادہ کچھ احساس نہ ہوتا کہ ہم ایک تنگ و تاریک سرنگ میں چل رہے ہیں۔

اس وسیع شہر کو ہم مکمل طور پر نہ دیکھ سکے اور نہ ہمارے لئے اس مختصر وقت میں یہ ممکن تھا، اس لئے کہ بتراء کا رقبہ ۳۰ کیلو میٹر مربع ہے بہر حال یہ سفر معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت انگیز اور سبق آموز بھی تھا، اور ہم کو آیت کریمہ۔

وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ۔ (الشعرآء — ۱۴۹) — اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

(باقی صـ۲۷۷ کا) شعراء، اطباء اور بڑے بڑے تاجر تھے جو مصر و شام اور فرات و روما کے علاقوں کا سفر کرتے رہتے تھے، اس کے باوجود وہ بت پرست تھے "لات" جس کو شمالی حجاز کے لوگ اٹھالائے تھے، اور جو ان کے یہاں مرکزی حیثیت رکھتا تھا، انھیں نبطیوں کے بتوں میں سے ایک تھا۔

کی مکمل تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔

رات میں عمان واپس آئے، بہت طویل فاصلہ طے کرنا پڑا تھا، اس سے پہلے ہم نے کار سے ایک روز میں اتنا طویل فاصلہ کبھی طے نہیں کیا تھا، اور ہمارے ذہن میں معلومات، تاثرات اور یادوں کا ایک ہجوم تھا۔

عمان سے روانگی

۲۰/ اگست ۱۹۷۳ء دوشنبہ کے روز ہم کو عمان سے ہندوستان کے لئے روانہ ہونا تھا طیارہ کی روانگی کا وقت شام کو تقریباً ساڑھے ۴ بجے تھا۔ جو احباب آخری ملاقات کے لئے تشریف لائے ان میں شیخ اسعد الحسینی سابق خطیب مسجد اقصیٰ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، شیخ کچھ دیر ہمارے ساتھ رہے، انھوں نے بیت المقدس کے یہودیوں کے قبضہ میں جانے کے چشم دید حالات، اور عرب رہناؤں کی کمزوری و بے حمیتی کے واقعات سنائے، ان کی گفتگو بڑی موثر اور رقت انگیز تھی، اسی طرح رابطہ علوم اسلامیہ کے صدر استاذ تیسیر ظبیان اہل علم کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف لائے، قبرص کے ایک ترکی وفد نے بھی ہم سے ملاقات کی اور اس ملک کی موجودہ صورت حال کی وضاحت کی جو ایک سنگین عبوری مرحلہ سے گزر رہا ہے، اور جہاں ترک مسلمان اپنی اسلامی شخصیت و انفرادیت اور اپنے قومی وجود کے تحفظ کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

استاذ کامل الشریف نے موتمر اسلامی کی جانب سے وفد کے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا، جس میں بعض ان علمی اور دینی شخصیات سے ملنے کا اتفاق ہوا جن سے اس مختصر دورہ میں پروگرام کے ہجوم کی وجہ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی، مثلاً کلیۃ الشریعہ کے پرنسپل شیخ عبدالعزیز خیاط[1]

---

[1] موجودہ وزیر اوقاف اردن۔

ہمارے محترم میزبان ڈاکٹر اسحاق فرحان ہم کو رخصت کرنے کے لئے ہوٹل تشریف لائے آپ کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے اساتذہ اور معزز حضرات آگئے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہوگئے، ہمارے فاضل دوست اور رفیق وفد ڈاکٹر عبداللہ عزام جن کا ہمارے دلوں پر بہت گہرا اور خوشگوار اثر ہے ہمارے دیرینہ رفیق ڈاکٹر ادیب صالح ایڈیٹر رسالہ "حضارۃ الاسلام" اور شام یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ کے استاذ جو ان دنوں کلیۃ الشریعۃ عمان میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اور جن سے ایک طویل وقفہ کے بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی، سعودی قائم مقام سفیر استاذ محمد ہیش اور استاذ کامل الشریف نے وفد کو رخصت کیا، اللہ تعالےٰ ان تمام حضرات کو ہماری طرف سے جزائے خیر دے۔

اشاریہ

(انڈکس)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

اشخاص

(الف)

(ب) (پ)

(ت)

(ط)

(ظ)

(ع)

فرق وملل

اقوام وقبائل ـ نسل وخاندان

سلطنتیں

ادارے اور تحریکات

کتابیات

مقامات

مدارس و درسگاہ

جامعات و کلیات اور دارالعلوم ملاحظہ فرمائیے "تحریکات"

خانقاہ

مساجد

مقابر و مزارات

متفرقات

باغ و چمن

دریا و سمندر

پہاڑ

محل و عمارات و آثار

ہوٹل و قیام گاہ

میوزیم

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک

"....یہ سفرنامہ ان ممالک (افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور شرق اردن) کی زندگی کے مختلف گوشوں، ان کے مسائل و مشکلات، وہاں کی فکری تہذیبی اور نفسیاتی کشمکش اور ان کی رہنمائی کی ضرورتوں کی ایک بولتی ہوئی تصویر بن گیا ہے جس کی مدد سے ناظرین اور ان ممالک کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو صحیح واقفیت اور ان ممالک کے حالات و حوادث کا صحیح ادراک حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ اس سفر کا آغاز افغانستان کے دارالحکومت کابل سے اور اس کا اختتام اردن کے دارالحکومت عمان پر ہوا اس مناسبت سے مصنف نے کتاب کا نام "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" رکھا، یہ دونوں تاریخی دریا ان دونوں سروں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اور ان سے ماضی و حال کے بہت سے تاریخی و اسلامی حوادث و حالات وابستہ رہے ہیں اور جن کے درمیان قرن اول کے اسلامی فتوحات کے دھارے نے ربط و اتصال پیدا کر دیا تھا۔" (از مقدمۂ کتاب)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ